

ناصر گامی



Urdu Poetry Collection

urdukutabkhanapk.blogspot

ناصر کاظمی

ایک نظر میں

پیدائش	۸ دسمبر، ۱۹۲۵ء
وفات	محلہ قاضی واڑہ، نیاز نبی بن بوعلی بخش (نانا) کے گھر میں، کینرہ منزل، انبالہ، ہریانہ، انڈیا ۲ مارچ، ۱۹۷۲ء، لاہور، پنجاب، پاکستان
عمر	۴۶ برس
تخلص	ناصر
پیدائشی نام	سید ناصر رضا کاظمی
پیشہ	شاعر، صحافی، مصنف، ریڈیو پاکستان میں اسٹاف ایڈیٹر پاکستانی
قومیت	اردو
نژادیت	نیشنل ہائی اسکول، پشاور
مادر علمی	ڈی۔ بی۔ ٹیڈ اسکول، ڈاکشائی مسلم ہائی اسکول، انبالہ اسلامیہ کالج، لاہور گورنمنٹ کالج لاہور
اصنافِ ادب	شاعری (غزل) شفیقہ بانو (شفیقہ تسکین) بیت سید انوار الحق بن عبدالعزیز
زوجہ	دو بیٹے
اولاد	ناصر سلطان کاظمی (ایم بی اے) حسن سلطان کاظمی تین پوتے پوتیاں ڈاکٹر وجاہت بصیر ارتضا حسن کاظمی آمنہ حسن کاظمی
اقرباء	کینرہ محمدی (والدہ) سید محمد سلطان کاظمی بن شریف الحسن (والد) انصار رضا کاظمی (بھائی)

کتابت کے لئے انگریزی کی کتابت سے چاہے اس خطاط
کا بھی حساب سے لڑتے ہو، وہ اس کے لئے ہتھیار
کی پستی میں نہ صرف اپنی اپنی فنی کمال پر
کا بھی حساب کی پستی تسلیم و فراموش کرے۔

مطابق شہر ہمارے کا ہے پتہ ہمارے خطاط کا بھی ہوتا
ہو جائے گی یہ کہ جو خطاط اس میں جس قدر کمال
حاصل ہے، وہ اس کا بھی نام لے لے گا۔ اس کی
تصویر سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم
کا بھی اس کی تعلیم ہی کی تعلیم کے لئے اس کے
کافی نام لے لے گا۔ اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

دل کی جگہ لے لیا وہ دل وہ کون کی گئی ہے
پہاں کو کھینچنے سے طغیاب سے کائن کی گئی ہے

پھر سلطان کی سبب کا منہ پر ہوا شہر ہر ان کا
مگر تیرے تیرے دور کے رہا جس کے شہر کی موتوں کے ساتھ
خبر پر بندہ کر کے نہایت سے ملوث شہر ملوث کے بہکان
کون سا شہر کس کس کا ہے پھر ہر سلطان کی کس کس کے
کس کس کی جگہ سے ملوث ہے کہ کس کا پھر سلطان کی کس کس کی جگہ ہے

کس کس کی جگہ سے ملوث ہے کہ کس کا پھر سلطان کی کس کس کی جگہ ہے
کس کس کی جگہ سے ملوث ہے کہ کس کا پھر سلطان کی کس کس کی جگہ ہے
کس کس کی جگہ سے ملوث ہے کہ کس کا پھر سلطان کی کس کس کی جگہ ہے
کس کس کی جگہ سے ملوث ہے کہ کس کا پھر سلطان کی کس کس کی جگہ ہے

[illegible]

گفتنی حوزہ توحید و ہدایت کے صاحب کلمی صاحب کو بھی یہی ہیئت کا
قد نظر نہ آیا ہو۔ یہ سب سچے سچے مروجہ جہاد کے نام پر کلمی صاحب کے لئے تیار
ہوئی اور ان کا مقصد کلمی صاحب کو اپنی کتب میں لکھ کر ان کو قدرت
نے پھر صاحب کو گفتنی مساجد میں سے ہلاک کیا۔ یہاں تک کہ
ابین نے ان مساجد میں کلمی صاحب کو پتہ نہ ہو، ایک شاعر کی
حقیقت سے دریافت ہو میں ضرور کہنے ہوں کہ اس کے بعد یہ
بڑی طرف مذہب ہے۔

[illegible]

ہر نئی محرم سب کو آپ کا نام کی ضرورت ہے
 قابل اہل ہر نئی سب کو آپ کا نام کی ضرورت ہے
 ہر نئی سب کو آپ کا نام کی ضرورت ہے
 ہر نئی سب کو آپ کا نام کی ضرورت ہے

اپنی محنت کے ثمر سے ہر نیکو شاعری چارہ لگا کر
 نہیں سیکھ کہ ہم صاف سب میں اپنی ہر رنگ کے ساتھ
 ہم ترانہ راج کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ادا کی میں بہ
 ہر آواز کا کئی کے مقابلے میں غزل جانی تھی یہ اس
 دہائی کی بات ہے بہ ہر کام میں اس کے ساتھ ہر جگہ
 تھے، خود، محفل کا کٹر مست، حسینوں کے دل کو جی
 دہر کا کلاں لگی کی دہر نظر آتی ہے۔

حرام اور حلال میں ناجائز اور جائز فیصلہ دینے کے ہر مسئلے میں
 کیا کہہ چکے ہو، لیکن یہ کہہ دو کہ اگر وہی فیصلہ دینے کے لئے
 تیسرے شخص ضرور کہہ دیں تو کیا ہوں گا۔

[illegible][illegible]

میرا کہیں بھی لوگوں نے اسلام اے کے مطلق کیا کہ
بہت اعلیٰ ہے کہ وہ ہے۔

اگر ہمارا کامیابی کی قسم کوئی پر نظر آتی ہے تو کیا یہ قسم جو
اس کے کام کی مکمل کرنا ہے، بالکل مستعد ہے۔

کم کھاتے لیکن جتنا کھاتے ہیں ان کا وزن بڑھتا رہتا ہے

پھر سلطان کا حکامری سرحد پار کیا اور وہاں پہلے دقتی
 ہو کر سر سے لٹل جڑا لیکن کرنا اس نے کہ ہر کامی
 بہت بہت تھل تھل معروف شہر کی ہر صاحب کے گھر
 پہنچ گئی یہاں تک کہ بعض ملکہ اور عورتی سے
 شیفہ کے جسے علم پہنچتے تھے کہ ہر صاحب کے گھر
 شہر و دیہات کی ہر صاحب کے گھر آئے تھے کہ ہر صاحب کے گھر
 آئی تھیں کہ ہر صاحب کے گھر آئی تھیں کہ ہر صاحب کے گھر
 آئی تھیں کہ ہر صاحب کے گھر آئی تھیں کہ ہر صاحب کے گھر

ہمارے ہر شخص کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ ہماری دنیا بڑی بڑی ہے مگر ہمیں اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا چاہیے۔

ناصر صاحب نے دو قرآنی کراں سے پہلے ہی کہی
آپادہاتی سے محفوظ رہی کہ پہلے ہی ہم صبر کو اپنی
شاعری میں سونے کی خوشی کی دہرہ نہ لکھی شاعری کی
کلیں میں شاعر کے لیے ہر صبر، ہر صبر، ہر صبر، ہر صبر
کو صبر سے خود بخود ہی شاعری کی شاعری کی شاعری
چاہت کی ہے، لیکن صبر کی ہے اس صبر کی ہے اس
زمانہ کی ہے کہ رنگ ہر رنگ کے ہے اس صبر کی ہے
حقیقت ہے کہ صبر ہی ہے اس صبر کی ہے اس صبر کی ہے
اس صبر کی ہے اس صبر کی ہے اس صبر کی ہے اس صبر کی ہے
اس صبر کی ہے اس صبر کی ہے اس صبر کی ہے اس صبر کی ہے

فہرست کے ابتدائی حصہ میں ہر صاحب قلم کے حصول کی خاطر انگلستان پہنچنے والوں میں علمی اور ادبی سرگرمیوں میں سے ہر صاحب رابطہ مانگے۔ انہی رابطوں میں تعلیمی کارروائی کے علاوہ ادبی طور پر اپنے سرگرم ہوتے ہوئے آپ کے تعلق کے گہرائی میں انجلی ہونے لگے۔ گہرے دوسری قوموں اور زبانوں کے شاعروں اور نثریوں سے بھی رابطہ استوار ہونے لگا۔

حالتِ جگہ بدلنے سے ہوتی نہیں میری
ہوتی ہے ہر جگہ کی کچھ اپنی خرابیاں
اس کی شخصیت ہی اسبے کہ اس میں تھا
کچھ خرابیاں خراب، کچھ اچھی خرابیاں



سید ناصر رضا کاظمی، (1925-1972) پاکستان سے ایک اردو شاعر اور اس زمانے کا سب سے بڑا شاعروں میں سے ایک تھے، بالخصوص استعارے اور چھوٹی بہر کے استعمال میں ان کا شاعری کوئی نہیں ملتا۔ کالجی انبالہ، ہریانہ میں 8 دسمبر 1925ء کو پیدا ہوئے۔

تعلیم اور کیریئر

ناصر کاظمی نے انبالہ، شملہ کے بعد اسلام آباد، کالج، لاہور میں تعلیم حاصل کی، وہ 1945 میں انبالہ واپس آئے اور آبپانی زمین کی دیکھ بھال شروع کر دی، 1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد وہ لاہور تشریف لے آئے۔

انہوں نے ایک ایڈیٹر کے طور پر "اوراقِ نو" کے ساتھ کچھ صحافتی کام کیا اور 1952 میں میگزین "ہمایوں" کے مدیر اعلیٰ بن گئے۔ بعد میں دورِ ریٹرو پاکستان، لاہور اور دیگر اپنی مطبوعات اور تحفوں کے ساتھ شملک رہے۔

نامرکا لکھی ہے آخر شاعری کے انداز پر عمل کرتے ہوئے 1940 میں شاعرانہ زندگی کا آغاز کیا اور ربوایں نظمیں اور sonnets لکھیں۔ بعد میں انہوں نے حقیقہ و شوید پر مبنی کہ ربوایں میں غزل لکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میر تقی میر کا ایک بہت بڑا مداح تھا۔ نامرکا لکھی کی شاعری میں اداسی اور احساسِ حرمی کے جذباتِ یقیناً بیکار جا شاعر ہے۔ شاعری میں ان کے استاد حقیقہ و شوید پر مبنی ہے۔ شاعری میں غم و فطرت کی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔

انہوں نے اگست 1947ء میں ایالہ، بھارت سے لاہور، پاکستان ہجرت کی۔ انہوں نے، پیرایہ پاکستان کے لئے ایک انتہائی اہمیت کے طور پر کام کیا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہی پاکستان میں وقت بتایا کرتے یا لاہور، مال روڈ پر گھومنا کرتے۔ انہیں گھومتے، اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ کھانے کا شوق تھا۔ عام طور پر وہ ایک دھکی شاعر کے طور پر نظر آتے ہیں مگر ان کی شاعری حقیقت میں رومانوی خوشی اور امید کے پہلو پر مبنی ہے۔

ان کی آخری چار کتابیں 2 مارچ 1972 کو لاہور میں
پبلش کے گئے۔ ان کی موت کے بعد شائع کی
گئیں۔ موت سے چند روز پہلے انھار احسن کے
ساتھ ایک نئی وی آر ٹیو میں انھوں نے کہا کہ...
گاؤں میں میرا پسندیدہ مشغلہ گھوڑا، گھڑ سواری،
شکار، پہاڑوں کا دورہ، دریا کے ساتھ چلنا وغیرہ تھے
اور میرے ذہن میں فطرت سے محبت اور شاعری
میں اظہار جذبات کرنے کے لئے شاید یہ وقت
تھا۔

میرے تمام مشاغل فنونِ لطیفہ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جسے گانا، شاعری، خطا، شعر، علم، پرندوں کی محبت، درختوں کی محبت وغیرہ... میں نے اپنی وجہ سے شاعری شروع کی۔ میں تمام خوبصورت چیزیں جو میں دیکھتا ہوں جو میرے ہاتھ میں نہیں ہیں، اور وہ مجھے سے دور ہیں، انہیں اپنے کام میں سمو سکوں۔ کچھ حالت جو فوت ہو جائیں انہیں زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سب شاعری میں زندہ ہو سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے شاعری شروع کر دی!"

کتاب

- [illegible]

آئینہ لے لے صبا پھر آئی

آئینہ لے لے صبا پھر آئی
بجھتی آنکھوں میں ضیا پھر آئی
تازہ رس لمحوں کی خوشبو لے کر
گل زمینوں کی ہوا پھر آئی
سرمی دیس کے سپنے لے کر
شبم زمزمہ پا پھر آئی
پھر چمکنے لگیں سونی راہیں
ساربانوں کی صدا پھر آئی
پھر کوئی فتادلہ گزرا ہتا یہاں
وہی آوازِ درا پھر آئی

ناصر قاضی



آج تو بے سبب اداس ہے جی

آج تو بے سبب اداس ہے جی
عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی
جلتا پھرتا ہوں میں دوپہروں میں
جانے کیا چیز کھو گئی میری
وہیں پھرتا ہوں میں بھی خاک بسر
اس بھرے شہر میں ہے ایک گلی
چھپتا پھرتا ہے عشق دنیا سے
پھیلتی جارہی ہے رسوائی
ہم نشیں کیا کہوں کہ وہ کیا ہے
چھوڑ یہ بات نیند اڑنے لگی
آج تو وہ بھی کچھ خموش سا تھا
میں نے بھی اُس سے کوئی بات نہ کی
ایک دم اُس کے ہونٹ چوم لیے
یہ مجھے بیٹھے بیٹھے کیا سوچی
اک دم اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا
جانے کیا بات درمیاں آئی
تو جو اتنا اداس ہے ناصر
تجھے کیا ہو گیا بتا تو سہی

ناصر کاظمی



آرائش خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو

آرائش خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو
یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنج بے خمار کی اب انتہا بھی ہو
یہ کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو
ٹوٹے کبھی تو خوابِ شب و روز کا طلسم
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو
دیوانگیء شوق کو یہ دھن ہے کہ ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے دردیوار سا بھی ہو
جز دل کوئی مکان نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ رہے درکھلا بھی ہو
ہر ذرہ ایک محملِ عبرت ہے دشت کا
لیکن کسے دکھاؤں کوئی دیکھتا بھی ہو
ہر شے پکارتی ہے پس پردہء سکوت
لیکن کسے سناؤں کوئی ہم نوا بھی ہو
فرصت میں سن شگفتگیء غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو
بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو تو ہمیں دیکھتا بھی ہو
بزمِ سخن بھی ہو سخنِ گرم کے لیے
طاوس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

ناصر کاظمی



آنکھوں میں ہیں دکھ بھرے فسانے

آنکھوں میں ہیں دکھ بھرے فسانے
رونے کے پھر آ گئے زمانے
پھر درد نے آگِ راگ چھیڑا
لوٹ آئے وہی ستمے پرانے
پھر چاند کو لے اڑی ہوائیں
پھر بانسری چھیڑ دی ہوا نے
رستوں میں ادا اس خوشبوؤں کے
پھولوں نے لٹا دیے حُزبانے

ناصر کاظمی



آہ پھر نغمہ بنا چاہتی ہے

آہ پھر نغمہ بنا چاہتی ہے
حنا مشی طرزِ ادا چاہتی ہے
آج پھر وسعتِ صحرائے جنوں
پر ش آبلہ پا چاہتی ہے
دیکھ کیفیتِ طوفانِ بہار
بوئے گل رنگِ ہوا چاہتی ہے
موتِ آرائشِ ہستی کے لئے
خندہ زخمِ وفا چاہتی ہے
دل میں اب حنا تمنا بھی نہیں
زندگی برگ و نوا چاہتی ہے
سوچ اے دشمنِ اربابِ وفا
کیوں تجھے حلقِ خدا چاہتی ہے
اک ہمیں بارِ چمن ہیں ورنہ
غنجے غنجے کو صبا چاہتی ہے

ناصرِ ناظمی



اب اُن سے اور تقاضائے بادہ کیا کرتا

اب اُن سے اور تقاضائے بادہ کیا کرتا
جو مل گیا ہے میں اُس سے زیادہ کیا کرتا
بھلا ہوا کہ ترے راستے کی خاک ہوا
میں یہ طویل سفر پا پیادہ کیا کرتا
مسافروں کی تو خیر اپنی اپنی منزل تھی
تری گلی کو نہ جاتا تو جادہ کیا کرتا
تجھے تو گھیرے ہی رہتے ہیں رنگ رنگ کے لوگ
ترے حضور مرا حرفِ سادہ کیا کرتا
بس ایک چہرہ کتابی نظر میں ہے ناصر
کسی کتاب سے میں استفادہ کیا کرتا

ناصر کاظمی



اپنی دھن میں رہتا ہوں

اپنی دھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں
او پچھلی رت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کسکر چتا ہوں
مجھ سے آنکھ ملائے کون
میں تیرا آئینہ ہوں
میرا دیا جلائے کون
میں ترا حالی کمرہ ہوں
تیرے سوا مجھے پہنے کون
میں ترے تن کا کپڑا ہوں
تو حبیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں
آتی رت مجھے روئے گی
حباتی رت کا جھونکا ہوں
اپنی لہر ہے اپنا روگ
دریا ہوں اور پیسا ہوں

ناصر قاضی



اداسیوں کا سماں محفلوں میں چھوڑ گئی

اداسیوں کا سماں محفلوں میں چھوڑ گئی
بہار ایک خاش سی دلوں میں چھوڑ گئی
نچھڑ کے تجھ سے ہزاروں طرف خیال گیا
تری نظر مجھے کن منزلوں میں چھوڑ گئی
کہاں سے لائے اب اُس نگاہ کو ناصر
جو ناتمام امنگیں دلوں میں چھوڑ گئی

ناصر کاظمی



اس دنیا میں اپنا کیا ہے

اس دنیا میں اپنا کیا ہے
کہنے کو سب کچھ اپنا ہے
یوں تو شبنم بھی دریا ہے
یوں تو دریا بھی پیاسا ہے
یوں تو ہر ہیرا بھی کنکر
یوں تو مٹی بھی سونا ہے
منہ دیکھے کی باتیں ہیں سب
کس نے کس کو یاد کیا ہے
تیرے ساتھ گئی وہ رونق
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے
بات نہ کر صورت تو دکھا دے
تیرا اس میں کیا جاتا ہے
دھیان کے آتش دان میں ناصر
بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے

ناصر قاضی



اس سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے

اس سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
ابھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ کہتی ہیں
یہ خاموشی، آواز نما کچھ کہتی ہے
سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوئے ہیں
اور دور کہیں کونسل کی صدا کچھ کہتی ہے
جب صبح کو چڑیاں باری باری بولتی ہیں
کوئی نامانوس اداس نوا کچھ کہتی ہے
جب رات کو تارے باری باری جاگتے ہیں
کئی ڈوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے
کبھی بھور بھئے کبھی شام پڑے کبھی رات گئے
ہر آن بدلتی رت کی ہوا کچھ کہتی ہے
مہمان ہیں ہم مہمان سرائے یہ نگری
مہمانوں کو مہمان سرا کچھ کہتی ہے
بیدار رہو بیدار رہو بیدار رہو
اے ہم سفر و آوازِ ردا کچھ کہتی ہے
ناصر آشوبِ زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

ناصرِ قاسمی



او میرے مصروف خدا

او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا
جھونپڑی والوں کی تقدیر
بجھا بجھا سا ایک دیا
حناک اڑاتے ہیں دن رات
میلوں پھیل گئے صحرا
زاغ و زغن کی چیخوں سے
سونا جنگل چیخ اٹھا
پیاسی دھرتی جلتی ہے
سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا
او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

ناصر قاضی



اوّلےں چاند نے کیا بات سُجھائی مجھ کو

اوّلےں چاند نے کیا بات سُجھائی مجھ کو
یاد آئی تری انگشتِ حنائی مجھ کو
سرِ ایوانِ طربِ نغمہ سرا تھا کوئی
رات بھر اس نے تری یاد دلائی مجھ کو
دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو
انہی آنکھوں نے دکھائے کئی بھر پور جمال
انہیں آنکھوں نے شبِ ہجر دکھائی مجھ کو
سائے کی طرح مرے ساتھ رہے رنج و الم
گردشِ وقت کہیں راس نہ آئی مجھ کو
دھوپ اُدھر ڈھلتی تھی۔ دل ڈوب اُدھر جاتا تھا
آج تک یاد ہے وہ شامِ جدائی مجھ کو
شہرِ لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

ناصرِ ناظمی



ایک نگر میں ایسا دیکھا دن بھی جہاں اندھیر

ایک نگر میں ایسا دیکھا دن بھی جہاں اندھیر
پچھلے پہر یوں چلے اندھیری جیسے گر جیں شیر
ہوا چلی تو پنکھ پنکھیر و بستی چھوڑ گئے
سونی رہ گئی کنگنی، خالی ہوئے منڈیر
بچپن میں بھی وہی کھلاڑی بنا ہے اپنا میت
جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہری بیر
یارو تم تو ایک ڈگر پر ہار کے بیٹھ گئے
ہم نے تپتی دھوپ میں کائے کڑے کوس کے پھیر
اب تو اس دیس میں یوں آیا سیلاب
کب کی کھڑی حویلیاں پل میں ہو گئیں ڈھیر

ناصر کاظمی



اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی

اے ہم سخن وفا کا تقاضا ہے اب یہی
میں اپنے ہاتھ کاٹ لوں تو اپنے ہونٹ سی
کن بے دلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کی نور نہ باتوں میں تازگی
بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی
وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور مجھ گیا
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی
بیٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی
بازار بند راستے سنسان بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی
گلیوں میں اب تو شام سے پھرتے ہیں پہرہ دار
ہے کوئی کوئی شمع سو وہ بھی بجھی بجھی
اے روشنی دیدہ و دل اب نظر بھی آ
دنیا ترے فراق میں اندھیر ہو گئی
القصہ جیب چاک ہی کرنی پڑی ہمیں
گو ابتداءِ غم میں بڑی احتیاط کی
اب جی میں ہے کہ سرکشی پتھر سے پھوڑیے
ممکن ہے قلبِ سنگ سے نکلے کوئی پری
بیکار بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کوئی دن
تصویر کھینچے کسی موجِ خیال کی
ناصر بہت سی خواہشیں دل میں ہیں بے قرار
لیکن کہاں سے لاوں وہ بے فکر زندگی

ناصر نظامی

بدلی نہ اس کی روح کسی انقلاب میں

بدلی نہ اس کی روح کسی انقلاب میں
کیا چیز زندہ بند ہے دل کے رباب میں
لفظوں میں بولتا ہے رگِ عصر کا لہو
لکھتا ہے دستِ غیب کوئی اس کتاب میں
تو ڈھونڈتی ہے اب کسے اے شامِ زندگی
دو دن تو خرچ ہو گئے غم کے حساب میں
یارانِ زود نشہ کا عالم یہ ہے کہ آج
یہ رات ڈوب جائے گی جامِ شراب میں
نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں
یہ آج راہ بھول کے آئے کدھر سے آپ
یہ خواب میں نے رات ہی دیکھا تھا خواب میں

ناصر کاظمی



برف گرتی رہے آگ جلتی رہے

برف گرتی رہے آگ جلتی رہے
آگ جلتی رہے رات ڈھلتی رہے
رات بھر ہم یونہی رقص کرتے رہیں
نیند تنہا کھڑی ہاتھ ملتی رہے
برف کے ہاتھ پیانو بجاتے رہیں
حمام چلتے رہیں مے اچھلتی رہے

ناصر قاضی



بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
بلا رہی ہے ابھی تک وہ دل نشیں آواز
وہی دلوں میں تپش ہے، وہی شبوں میں گداز
مگر یہ کیا کہ مری زندگی میں سوز نہ ساز
نہ چھیڑ اے خلشِ درد، بار بار نہ چھیڑ
چھپائے بیٹھا ہوں سینے میں ایک عمر کا راز
بس اب تو ایک ہی دھن ہے کہ نیند آجائے
وہ دن کہاں کہ اٹھائیں شبِ فراق کے ناز
گزر ہی جائے گی اے دوست تیرے ہجر کی رات
کہ تجھ سے بڑھ کے تیرا درد ہے مرا ہم ساز
یہ اور بات کہ دنیا نہ سن سکی ورنہ
سکوتِ اہلِ نظر ہے بجائے خود آواز
یہ بے سب نہیں شام و سحر کے ہنگامے
اٹھا رہا ہے کوئی پردہ ہائے راز و نیاز
ترا خیال بھی تیری طرح مکمل ہے
وہی شباب، وہی دل کشی، وہی انداز
شراب و شعر کی دنیا بدل گئی لیکن
وہ آنکھ ڈھونڈ ہی لیتی ہے بے خودی کا جواز
عروج پر ہے مرا درد ان دنوں ناصر
مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز

ناصر کاظمی



بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جانکے

بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جانکے
یہ ہم سفر مرے کتنے گریز پانکے
چلے تھے اور کسی راستے کی دھن میں مگر
ہم اتفاق سے تیری گلی میں آ نکے
غم فراق میں کچھ دیر رو ہی لینے دو
بخار کچھ تو دل بے قرار کا نکے
نصیحتیں ہمیں کرتے ہیں ترکِ الفت کے
یہ خیر خواہ ہمارے کدھر سے آنکے
یہ خامشی تو رگ پے میں رچ گئی ناصر
وہ نالہ کر کہ دل سنگ سے صدا نکے

ناصر کاظمی



بے حجابانہ انجمن میں آ

بے حجابانہ انجمن میں آ
کم سخن محفل سخن میں آ
اے مرے آہوئے رمیدہ کبھی
دل کے اجڑے ہوئے نختن میں آ
دل کہ تیرا تھا، اب بھی تیرا ہے
پھر اسی منزل کہن میں آ
اے گلستانِ شب کے چشم و چراغ
کبھی اجڑے دلوں کے بن میں آ
کبھی فرصت ملے تو پچھلے پہر
شب گزیدوں کی انجمن میں آ
صبح نورس کی آنکھ کے تارے
چاند مرجھا گیا گہن میں، آ
رنگ بھر دے اندھیری راتوں میں
جانِ صبح وطن! وطن میں آ
پھول جھڑنے کی شام آ پنچی
نو بہارِ چمن! چمن میں آ

ناصر قاضی





بے منتِ خضرِ راہِ رہنا
منظور ہمیں تباہ رہنا
یاروں کو نصیبِ سرفرازی
مجھ کو تری گردِ راہِ رہنا
دل ایک عجیب گھر ہے پیارے
اس گھر میں بھی گاہ گاہ رہنا
گریبوں ہی رہ دلوں کی رنجش
مشکل ہے بہم نباہ رہنا
بھر آئے گی آنکھ بھی کسی دن
حالی نہیں صرفِ آہ رہنا
میں ہاتھ نہیں اسے لگایا
اے بے گہنی گواہ رہنا
ناصر یہ وفا نہیں جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیرخواہ رہنا

ناصرِ قاضی



پل پل کانٹا سا چبھتا تھا

پل پل کانٹا سا چبھتا تھا
یہ ملنا بھی کیا ملنا تھا
کانٹوں کے ویراں جنگل میں
میں کس مشکل سے پہنچا تھا
یہ جنگل اور تیری خوشبو
کیا میں سپنا دیکھ رہا تھا؟
آج وہ آنکھیں بجھی بجھی تھیں
میں جنہیں پیروں ہی تکتا تھا
کتنی باتیں کی تھیں لیکن
ایک بات سے جی ڈرتا تھا
تیرے ہاتھ کی چپائے تو پی تھی
دل کا رنج تو دل میں رہا تھا
میں بھی ماسٹر، تجھ کو بھی جلدی
گاڑی کا بھی وقت ہوا تھا
تو نے بھی کوئی بات نہ پوچھی
میں بھی تجھے کچھ کہہ نہ سکا تھا
اک احبڑے سے اسٹیشن پر
تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا
تیرے شہر کا اسٹیشن بھی
میرے دل کی طرح سونا تھا
کیسے کہوں روداد سفر کی
آگے موڑ جدائی کا تھا

ناصر کاظمی



پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے
پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے
پھر کاگا بولا گھر کے سونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بوند پڑی تم یاد آئے
پہلے تو میں چیخ کے رویا اور پھر ہنسنے لگا
بادل گر جا بجلی چمکی تم یاد آئے
دن بھر تو میں دنیا کے دھندوں میں کھویا رہا
جب دیواروں سے دھوپ ڈھلی تم یاد آئے

ناصر کاظمی



پھر لہو بول رہا ہے دل میں

پھر لہو بول رہا ہے دل میں
دم بدم کوئی صدا ہے دل میں
تاب لائیں گے نہ سننے والے
آج وہ نغمہ چھڑا ہے دل میں
ہاتھ ملتے ہی رہیں گے گل چیں
آج وہ پھول کھلا ہے دل میں
دشت بھی دیکھے چمن بھی دیکھا
کچھ عجب آب و ہوا ہے دل میں
رنج بھی دیکھے خوشی بھی دیکھی
آج کچھ درد نیا ہے دل میں
چشم تر ہی نہیں محو تسبیح
خوں بھی سرگرم دعا ہے دل میں
پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی
کوئی کانٹا سا چبھا ہے دل میں
پھر کسی غم نے پکارا شاید
کچھ اجالا سا ہوا ہے دل میں
کہیں چہرے کہیں آنکھیں کہیں ہونٹ
اک صنم خانہ کھلا ہے دل میں
اُسے ڈھونڈا وہ کہیں بھی نہ ملا
وہ کہیں بھی نہیں یا ہے دل میں
کیوں بھٹکتے پھریں دل سے باہر
دوستو شہر بسا ہے دل میں
کوئی دیکھے تو دکھاؤں ناصر
وسعت ارض و سما ہے دل میں

ناصر کاظمی

پھر نئی فصل کے عنوان چمکے

پھر نئی فصل کے عنوان چمکے
ابر گر جا گل باراں چمکے
آنکھ جھپکوں تو شرارے برسیں
انس کھینچوں تو رگِ جاں چمکے
کیا بگڑ جائے گا اے صبحِ جمال
آج اگر شامِ عنریباں چمکے
اے فلک بھیج کوئی برقِ خیال
کچھ تو شامِ شبِ ہجر ایں چمکے
پھر کوئی دل کو دکھائے ناصر
کاش یہ گھر کسی عنوان چمکے

ناصر کاظمی



پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے

پھول خوشبو سے جدا ہے اب کے
یارو یہ کیسی ہوا ہے اب کے
دوست بچھڑے ہیں کئی بار مگر
یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے
پتیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں
قتل گل عام ہوا ہے اب کے
شفقی ہو گئی دیوارِ خیال
کس قدر خون بہا ہے اب کے
منظر زخم وفا کس کو دکھائیں
شہر میں قحطِ وفا ہے اب کے
وہ تو پھر غیر تھے لیکن یارو
کام اپنوں سے پڑا ہے اب کے
کیا سنیں شورِ بہاراں ناصر
ہم نے کچھ اور سنا ہے اب کے

ناصرِ ناظمی



پہنچے گور کنارے ہم

پہنچے گور کنارے ہم
نس غم دوراں ہارے ہم
سب کچھ ہار کے رستے میں
بیٹھ گئے دکھیارے ہم
ہر منزل سے گزرے ہیں
تیرے غم کے سہارے ہم
دیکھ خیالِ حنا طرِ دوست
بازی جیت کے ہارے ہم
آنکھ کا تارا آنکھ میں ہے
اب نہ گئیں گے تارے ہم

ناصر قاضی



تارے گنوائے یا سحر دکھلائے

تارے گنوائے یا سحر دکھلائے
دیکھیے شامِ غم کہاں لے جائے
صبحِ نورس کا راگ سنتے ہی
شبِ گل کے چراغِ مرجھائے
صبح نکلے تھے فکرِ دنیا میں
حسانہ بربادِ دن ڈھلے آئے
کیوں نہ اس کم نسا کو چاند کہوں
چاند کو دیکھ کر جو یاد آئے

ناصر قاضی



تجھے کہنا ہے کچھ مگر خاموش

تجھے کہنا ہے کچھ مگر خاموش
دیکھ اور دیکھ کے گزر خاموش
یوں ترے راستے میں بیٹھا ہوں
جیسے اک شمع رہزور خاموش
تو جہاں ایک بار آیا تھا
ایک مدت سے ہے وہ گھر خاموش
اس گلی کے گزرنے والوں کو
تکتے رہتے ہیں بام و در خاموش
اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش
یہ زمیں کس کے انتظار میں ہے
کیا خبر کیوں ہے یہ نگر خاموش
شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفاں ہے پردہ در خاموش
اب کے بیڑا گزر گیا تو کیا
ہیں ابھی کتنے ہی بھنور خاموش
چڑھتے دریا کا ڈر نہیں یارو
میں ہوں ساحل کو دیکھ کر خاموش
ابھی وہ قافلے نہیں آئے
ابھی بیٹھیں نہ ہم سفر خاموش
ہر نفس اک پیام تھا ناصر
ہم ہی بیٹھے رہے مگر خاموش

ناصر ناطقی



ترے آنے کا دھوکہ سارہا ہے

ترے آنے کا دھوکہ سا رہا ہے
دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے
عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے
سنا ہے رات بھر برسائے بادل
مگر وہ شہر جو پیسا رہا ہے
وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے
کسے ڈھونڈو گے ان گلیوں میں ناصر
چلو اب گھر چلیں دن جا رہا ہے

ناصر کاظمی



ترے خیال سے لو دے اٹھی ہے تنہائی

ترے خیال سے لو دے اٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی
تو کس خیال میں ہے منزلوں کے شیدائی
انہیں بھی دیکھ جنہیں راستے میں نیند آئی
پکار اے جسِ کاروانِ صبحِ طرب
بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں تیرے سودائی
ٹھہر گئے ہیں سرِ راہ خاک اڑانے کو
مسافروں کو نہ چھیڑ اے ہوائِ صحرائی
رہِ حیات میں کچھ مرحلے تو دیکھ لے
یہ اور بات تری آرزو نہ راس آئی
یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی
دلِ فسرده میں پھر دھڑکنوں کا شور اٹھا
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی
میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پرا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی
جہاں بھی تھا کوئی فتنہ تڑپ کے جاگ اٹھا
تمام ہوش تھی مستی میں تیری انگڑائی
کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے، نہ وہ جلسے، نہ شہرِ رعنائی
وہ تابِ درد وہ سودائے انتظار کہاں
انہی کے ساتھ گئی طاقتِ شکیبائی
پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
چھڑ کے جس سے ہوئی شہرِ شہرِ رسوائی

ناصرِ ظہیر

ترے ملنے کو بے کل ہو گئے ہیں

ترے ملنے کو بے کل ہو گئے ہیں
مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں
بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنان جنگل ہو گئے ہیں
یہاں تک بڑھ گئے آلام ہستی
کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں
کہاں تک لائے ناتواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں
نگاہِ یاس کو نیند آ رہی ہے
مثرہ پر اشک بوجھل ہو گئے ہیں
انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
جنہیں ہک دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

ناصر قاضی



تم آگئے ہو تو کیوں انتظارِ شام کریں

تم آگئے ہو تو کیوں انتظارِ شام کریں
کہو تو کیوں نہ ابھی سے کچھ اہتمام کریں
خلوص و مہر وفا لوگ کر چکے ہیں بہت
مرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں
یہ خاص و عام کی بیکار گفتگو کب تک
قبول کیجیے جو فیصلہ عوام کریں
ہر آدمی نہیں شائستہ رموزِ سخن
وہ کم سخن ہو مخاطب تو ہم کلام کریں
جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں
خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشیوں کا انتظام کریں
رہ طلب میں جو گمنام مر گئے ناصر
متاعِ درد انہی ساتھیوں کے نام کریں

ناصرِ ناظمی



تنہا عیش کے خواب نہ بُن

تنہا عیش کے خواب نہ بُن
کبھی ہماری بات بھی سُن
تھوڑا غم بھی اُٹھا پیارے
پھول چُنے ہیں خار بھی چُن
سکھ کی نیندیں سونے والے
محرومی کے راگ بھی سُن

تنہائی میں تیری یاد
جیسے ایک سریلی دھُن
جیسے چاند کی ٹھنڈی لَو
جیسے کرنوں کی کُن مُن
جیسے جل پریوں کا ناچ
جیسے پائل کی جھُن جھُن

ناصر کاظمی



تو اسیر بزم ہے ہم سخن تجھے ذوقِ نالہ نے نہیں

تو اسیر بزم ہے ہم سخن تجھے ذوقِ نالہ نے نہیں
ترا دل گداز ہو کس طرح یہ ترے مزاج کی لے نہیں
ترا ہر کمال ہے ظاہری ترا ہر خیال ہے سرسری
کوئی دل کی بات کروں تو کیا ترے دل میں آگ تو ہے نہیں
جسے سن کے روح مہک اٹھے جسے پی کے درد چھک اٹھے
ترے ساز میں وہ صدا نہیں ترے میکدے میں وہ مے نہیں
کہاں اب وہ موسمِ رنگ و بو کہ رگوں میں بول اٹھے لہو
یونہی ناگوار چھین سی ہے کہ جو شاملِ رگ و پے نہیں
ترا دل ہو درد سے آشنا تو یہ نالہ غور سے سن ذرا
بڑا جاں گسل ہے یہ واقعہ یہ فسانہ جم و کے نہیں
میں ہوں ایک شاعرِ بے نوا مجھے کون چاہے مرے سوا
میں امیرِ شام و عجم نہیں میں کبیر کوفہ و رے نہیں
یہی شعر ہیں مری سلطنت اسی فن میں ہے مجھے عافیت
مرے کاسۂ شب و روز میں ترے کام کی کوئی شے نہیں

ناصر کاظمی



تو ہی بتا ترے بے خانماں کدھر جائیں؟

تو ہی بتا ترے بے خانماں کدھر جائیں؟
کہ راہ میں شجرِ سایہ دار بھی تو نہیں
فلک نے پھینک دیا برگِ گل کی چھاؤں سے دور
وہاں پڑے ہیں جہاں خارزار بھی تو نہیں
جو زندگی ہے تو بس تیرے درد مندوں کی
یہ جبر بھی تو نہیں، اختیار بھی تو نہیں
وفا ذریعہ اظہارِ غم سہی ناصر
یہ کاروبار کوئی کاروبار بھی تو نہ نہیں

ناصر قاضی



تو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانگین

تو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانگین
تیری گلی گلی کی خیر اے مرے دل رُبا وطن
وہ تو بس ایک موج تھی آئی ادھر ادھر گئی
آنکھوں میں ہے مگر ابھی رات کے خواب کی تھکن
پھر وہی دشتِ بے اماں پھر وہی رنجِ رائیگاں
دل کو جگا کے سو گئی تیرے خیال کی کرن
آیا گیا نہ میں کہیں صبح سے شام ہو گئی
جلنے لگے ہیں ہاتھ کیوں ٹوٹ رہا ہے کیوں بدن
کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے راہ میں میتِ شہر بے کفن
میکدہ بجھ گیا تو کیا رات ہے میری ہمنوا
سایہ ہے میرا ہم سبو چاند ہے میرا ہم سخن
دل ہے مرا لہو لہو تاب نہ لاسکے گا تو
اے مرے تازہ ہمنشیں تو مرا ہم سبو نہ بن

ناصر قاضی



تو ہے یا تیرا سایا ہے

تو ہے یا تیرا سایا ہے
بھیس خدائی نے بدلا ہے
دل کی حویلی پر مدت سے
حنا موٹی کا قفل پڑا ہے
چسچ رہے ہیں حنائی کمرے
شام سے کتنی تیز ہوا ہے
دروازے سر پھوڑ رہے ہیں
کون اس گھر کو چھوڑ گیا ہے
تہائی کو کیسے چھوڑوں
برسوں میں ایک یار ملا ہے
رات اندھیری ناو ساتھی
رستے میں دریا پڑتا ہے
ہچکی تھمتی ہی نہیں ناصر
آج کسی نے یاد کیا ہے

ناصر قاضی



تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی

تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی
آنکھ کہتی ہے ترے دل میں طلب ہے کوئی
آنچ آتی ہے ترے جسم کی عریانی سے
پیرہن ہے کہ سلگتی ہوئی شب ہے کوئی
ہوش اڑانے لگیں پھر چاند کی ٹھنڈی کرنیں
تیری بستی میں ہوں یا خوابِ طرب ہے کوئی
گیت بُنتی ہے ترے شہر کی بھرپور ہوا
اجنبی میں ہی نہیں تو بھی عجب ہے کوئی
لے جاتی ہیں کسی دھیان کی لہریں ناصر
دور تک سلسلہ تاکِ طرب ہے کوئی

ناصر کاظمی



ٹھہرا تھا وہ گل عذار کچھ دیر

ٹھہرا تھا وہ گل عذار کچھ دیر
بھر پور رہی بہار کچھ دیر
اک دھوم رہی گلی گلی میں
آباد رہے دیار کچھ دیر
پھر جھوم کے بستیوں پہ برا
ابر سر کوہسار کچھ دیر
پھر لالہ و گل کے مے کدوں میں
چھلکی مئے مشکبار کچھ دیر
پھر نف و مے کی صحبتوں کا
آنکھوں میں رہا خمار کچھ دیر
پھر شام وصال یار آئی
ہیلا غم روزگار کچھ دیر
پھر باگ اٹھے خوشی کے آنسو
پھر دل کو ملا فترار کچھ دیر
پھر ایک نشاط بے خودی میں
آنکھیں رہیں اشک بار کچھ دیر
پھر ایک طویل جبر کے بعد
صحت رہی خوشگوار کچھ دیر
پھر ایک نگار کے سہارے
دنیا رہی سازگار کچھ دیر

ناصر قاضی



جب تک نہ لہو دیدہ انجم میں ٹپک لے

جب تک نہ لہو دیدہ انجم میں ٹپک لے
اے دل قفسِ جاں میں ذرا اور پھڑک لے
ذّرے ہیں ہوس کے بھی زربِ وفا میں
ہاں جنسِ وفا کو بھی ذرا چھان پھٹک لے
پھر دیکھنا اُس کے لبِ لعلیں کی ادائیں
یہ آتشِ خاموش ذرا اور دہک لے
گونگا ہے تو لبِ بستوں سے آدابِ سخن سیکھ
اندھا ہے تو ہم ظلمِ رسیدوں سے چمک لے
ناصر سے کہے کون کہ اللہ کے بندے
باقی ہے ابھی رات ذرا آنکھ جھپک لے

ناصر قاضی



جب ذراتیز ہوا ہوتی ہے

جب ذراتیز ہوا ہوتی ہے
کیسی سنان فضا ہوتی ہے
ہم نے دیکھے ہیں وہ سٹائے بھی
جب ہر اک سانس صدا ہوتی ہے
دل کا یہ حال ہوا تیرے بعد
جیسے ویران سرا ہوتی ہے
رونا آتا ہے ہمیں بھی لیکن
اس میں توہین وفا ہوتی ہے
منہ اندھیرے کبھی اٹھ کر دیکھو
کیا تروتازہ ہوا ہوتی ہے
اجنبی دھیان کی ہر موج کے ساتھ
کس قدر تیز ہوا ہوتی ہے
غم کی بے نور گزر گاہوں میں
اک کرن ذوق فضا ہوتی ہے
غمگار سفر راہ وفا
مشرۂ آبلہ پا ہوتی ہے
گلشن فکر کی منہ بند کلی
شبِ مہتاب میں وا ہوتی ہے
جب نکلتی ہے نگارِ شبِ غم
منہ پہ شبنم کی روا ہوتی ہے
حادثہ ہے کہ حنا سے پہلے
بوئے گل ، گل سے جدا ہوتی ہے
اک نیا دور جسم لیتا ہے
ایک تہذیب فنا ہوتی ہے
جب کوئی غم نہیں ہوتا ناصر
بے کلی دل کی سوا ہوتی ہے

ناصر کاظمی

جب سے دیکھا ہے ترے ہات کا چاند

جب سے دیکھا ہے ترے ہات کا چاند
میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند
زلفِ شبِ رنگ کے صد راہوں میں
میں نے دیکھا ہے طلسمات کا چاند
رس کہیں روپ کہیں رنگ کہیں
ایک جادو ہے ملاقات کا چاند

ناصر کاظمی



جبیں پہ دھوپ سی آنکھوں میں کچھ حیا سی ہے

جبیں پہ دھوپ سی آنکھوں میں کچھ حیا سی ہے
تو اجنبی ہے مگر شکل آشنا سی ہے
خیال ہی نہیں آتا کسی مصیبت کا
ترے خیال میں ہر بات غم ربا سی ہے
جہاں میں یوں تو کسے چین ہے مگر پیارے
یہ تیرے پھول سے چہرے پہ کیوں اداسی ہے
دلِ غمیں سے بھی جلتے ہیں شادمانِ حیات
اسی چراغ سے اب شہر میں ہوا سی ہے
ہمیں سے آنکھ پڑاتا ہے اس کا ہر ذرہ
مگر یہ خاک ہمارے ہی خوں کی پیاسی ہے
ادس پھرتا ہوں میں جس کی دھن میں برسوں سے
یونہی سی ہے وہ خوشی بات وہ ذرا سی ہے
چمکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصر
کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اداسی ہے

ناصر قاضی



جرم انکار کی سزا ہی دے

جرم انکار کی سزا ہی دے
میرے حق میں بھی کچھ سنا ہی دے
شوق میں ہم نہیں زیادہ طلب
جر ترا نازِ کم نگاہی دے
تو نے تاروں سے شب کی مانگ بھری
مجھ کو اک اشکِ صبح گاہی دے
تو نے بنجر زمیں کو پھول دیے
مجھ کو اک زخمِ دل کشا ہی دے
بستیوں کو دیے ہیں تو نے چراغ
دشتِ دل کو بھی کوئی راہی دے
عمر بھر کی نواگری کا صلہ
اے خدا کوئی ہم نوا ہی دے
زرد رو ہیں ورق خیالوں کے
اے شبِ ہجر کچھ سیاہی دے
گر مجالِ سخن نہیں ناصر
لبِ خاموش سے گواہی دے

ناصر قاضی



جنت ماہی گیروں کی

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات حبزیروں کی
سبز سنہرے کھیتوں پر
پھواریں سرخ لکیریوں کی
اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی
کڑوے خواب عنریہوں کے
میٹھی نیند امیروں کی
رات گئے تیری یادیں
جیسے بارش تیروں کی
مجھ سے باتیں کرتی ہیں
حنا موشی تصویروں کی
ان ویرانوں میں ناصر
کان دبی ہے ہیروں کی

ناصر قاضی



جہاں تیرے غم نے قدم رکھ دیا

جہاں تیرے غم نے قدم رکھ دیا
سر طاق دنیا کا غم رکھ دیا
دکھا کر ہمیں دو جہانوں کے خواب
دلوں میں غم بیش و کم رکھ دیا
سحر دم فلک نے مرے سامنے
بجائے سبو، خوانِ غم رکھ دیا
برستے ہیں اطراف سے ہم پہ تیر
یہ کس راستے میں قدم رکھ دیا
ذرا دیکھ تو اے قسیم ازل
یہ کس ہاتھ پر جامِ جم رکھ دیا

ناصر قاضی



جو گفتنی نہیں وہ بات بھی سنا دوں گا

جو گفتنی نہیں وہ بات بھی سنا دوں گا
تو ایک بار تو مل، سب گلے مٹا دوں گا
مجال کیا، کوئی مجھ سے تجھے جدا کر دے
جہاں بھی جائے گا تو میں تجھے صدا دوں گا
تری گلی میں بہت دیر سے کھڑا ہوں مگر
کسی نے پوچھ لیا تو جواب کیا دوں گا
مری خموش نگاہوں کو چشم کم سے نہ دیکھ
میں رو پڑا تو دلوں کے طبق ہلا دوں گا
یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا اک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا
بہ پاس صحبتِ دیرینہ کوئی بات ہی کر
نظر ملا تو سہی میں تجھے دعا دوں گا
بلاؤں گا نہ ملوں گا نہ خط لکھوں گا تجھے
تری خوشی کے لیے خود کو یہ سزا دوں گا
وہ درد ہی نہ رہا ورنہ اے متاعِ حیات
مجھے گماں بھی نہ تھا میں تجھے بھلا دوں گا
ابھی تو رات ہے کچھ دیر سو ہی لے ناصر
کوئی بلائے گا تو میں تجھے جگا دوں گا

ناصر کاظمی



چمن در چمن وہ ر مق اب کہاں

چمن در چمن وہ ر مق اب کہاں
وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں
کراں تا کراں ظلمتیں چھا گئیں
وہ جلوے طبق در طبق اب کہاں
بجھی آتش گل، اندھیرا ہوا
! وہ اجلے سنہرے ورق اب کہاں
برابر ہے ملنا نہ ملنا ترا
بچھڑنے کا تجھ سے قلق اب کہاں

ناصر کاظمی



چند گھرانوں نے مل جل کر

چند گھرانوں نے مل جل کر
کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
باہر کی مٹی کے بدلے
گھر کا سونا بیچ دیا ہے
سب کا بوجھ اٹھانے والے
تو اس دنیا میں تھا ہے
میلی چادر اڑھنے والے
تیرے پاؤں تلے سونا ہے
گہری نیند میں جاگو ناصر
وہ دیکھو سورج نکلا ہے

ناصر قاضی



چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں

چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں
سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تیری یادیں
تو جیسے مرے پاس ہے اور مجھِ سخن ہے
محفل سی جما دیتی ہیں اکثر تیری یادیں
میں کیوں نہ پھروں تپتی دوپہروں میں ہر اسماں
پھرتی ہیں تصوّر میں کھلے سر تری یادیں
جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سرِ شام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تیری یادیں

ناصر کاظمی



چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو

چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو
دل کی افسردگی کچھ کم تو ہوئی ہم نفسو شکر کرو
آو پھر یادِ عزیزاں ہی سے میخانہ جاں گرم کریں
دیر کے بعد یہ محفل تو جی ہم نفسو شکر کرو
آج پھر دیر کی سوئی ہوئی ندی میں نئی لہر آئی
دیر کے بعد کوئی ناؤ چلی ہم نفسو شکر کرو
رات بھر شہر میں بجلی سی چمکتی رہی ہم سوئے رہے
وہ تو کہیے کہ بلا سر سے ٹلی ہم نفسو شکر کرو
درد کی شاخ تھی کاسہ میں اشکوں کے نئے پھول کھلے
دل جلی شام نے پھر مانگ بھری ہم نفسو شکر کرو
آسماں لالہ خونیں کی نواؤں سے جگر چاک ہوا
قصر بیدار کی دیوار گری ہم نفسو شکر کرو

ناصر کاظمی



حاصلِ عشقِ ترا حُسنِ پشیاں ہی سہی

حاصلِ عشقِ ترا حُسنِ پشیاں ہی سہی
میری حسرت تری صورت سے نمایاں ہی سہی
حُسن بھی حُسن ہے محتاجِ نظر ہے جب تک
شعلہٴ عشقِ چراغِ تہِ داماں ہی سہی
کیا خبر خاک ہی سے کوئی کرن پھوٹ پڑے
ذوقِ آوارگی دشت و بیاباں ہی سہی
پردہٴ گل ہی سے شاید کوئی آواز آئے
فرصتِ سیر و تماشاے بہاراں ہی سہی

ناصر کاظمی



حسن کہتا ہے اک نظر دیکھو

حسن کہتا ہے اک نظر دیکھو
دیکھو اور آنکھ کھول کر دیکھو
سن کے طاؤس رنگ کی جھنکار
ابر اٹھا ہے جھوم کر دیکھو
پھول کو پھول کا نشان جانو
چاند کو چاند سے ادھر دیکھو
جلوہ رنگ بھی ہے اک آواز
شاخ سے پھول توڑ کر دیکھو
جی جلاتی ہے اوس غربت میں
پاؤں جلتے ہیں گھاس پر دیکھو
جھوٹی امید کا فریب نہ کھاؤ
رات کالی ہے کس قدر دیکھو
نیند آتی نہیں تو صبح تلک
گردِ مہتاب کا سفر دیکھو
اک کرن جھانک کر یہ کہتی ہے
سونے والو ذرا ادھر دیکھو
خم ہر لفظ ہے گل معنی
اہل تحریر کا ہنر دیکھو

ناصر قاضی



ختم ہوا تاروں کا راگ

ختم ہوا تاروں کا راگ
ہباگ مافنراب توحباگ
دھوپ کی جہلتی تانوں سے
دشتِ فلک میں لگ گئی آگ
دن کا سنہرا نغمہ سن کر
ابلق شب نے موڑی ہباگ
کلیاں جھلسی جہاتی ہیں
سورج پھینک رہا ہے آگ
یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جہلدی ہباگ

ناصر قاضی



خوشی انگلیاں چٹا رہی ہے

خوشی انگلیاں چٹا رہی ہے
تری آواز اب تک آ رہی ہے
دل وحشی لیے جاتا ہے لیکن
ہوا زنجیر سی پہنا رہی ہے
ترے شہر طرب کی رونقوں میں
طبیعت اور بھی گھبرا رہی ہے
کرم اے صرصرِ آلامِ دوراں
دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے
کڑے کوسوں کے سناٹے میں لیکن
تری آواز اب تک آ رہی ہے
طنابِ خیمہ گل تھام ناصر
کوئی آندھی اُفق سے آ رہی ہے

ناصرِ ناظمی



خواب میں رات ہم نے کیا دیکھا

خواب میں رات ہم نے کیا دیکھا
آنکھ کھلتے ہی چاند سا دیکھا
کیاریاں دھول سے اٹی پائیں
آشیانہ جلا ہوا دیکھا
فاختہ سر نگوں بولوں میں
پھول کو پھول سے جدا دیکھا
اُس نے منزل پہ لا کے چھوڑ دیا
عمر بھر جس کا رستا دیکھا
ہم نے موتی سمجھ کے چوم لیا
سنگریزہ جہاں پڑا دیکھا
کم نما ہم بھی ہیں مگر پیارے
کوئی تجھ سا نہ خود نما دیکھا

ناصر کاظمی



خیالِ ترکِ تمنا نہ کر سکے تو بھی

خیالِ ترکِ تمنا نہ کر سکے تو بھی
اداسیوں کا مداوا نہ کر سکے تو بھی
کبھی وہ وقت بھی آئے کہ کوئی لمحہ عیش
مرے بغیر گوارا نہ کر سکے تو بھی
خدا وہ دن بھی دکھائے تجھے کہ میری طرح
مری وفا پہ بھروسہ نہ کر سکے تو بھی
میں اپنا عقدہ دل تجھ کو سونپ دیتا ہوں
بڑا مزا ہو اگر وا نہ کر سکے تو بھی
تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کیا ہوگا
مجھے یہ ضد کہ مداوا نہ کر سکے تو بھی
نہ کر خیالِ تلافی کہ میرا زخم وفا
وہ زخم ہے جسے اچھا نہ کر سکے تو بھی

ناصر ناظمی



درد کا نٹا ہے اس کی چھن پھول ہے

درد کا نٹا ہے اس کی چھن پھول ہے
درد کی خامشی کا سخن پھول ہے
اڑتا پھرتا ہے پھلوار یوں سے جدا
برگِ آوارہ جیسے پون پھول ہے
اس کی خوشبو دکھاتی ہے کیا کیا سے
دشتِ غربت میں یادِ وطن پھول ہے
تختِ ریگ پر کوئی دیکھے اسے
سانپ کے زہر میں رس ہے، پھن پھول ہے
میری لے سے مہکتے ہیں کوہ و دمن
میرے گیتوں کا دیوانہ پن پھول ہے

ناصر کاظمی



درد کم ہونے لگا آؤ کہ کچھ رات کٹے

درد کم ہونے لگا آؤ کہ کچھ رات کٹے
غم کی معیاد بڑھا جاؤ کہ کچھ رات کٹے
ہجر میں آہ و بکا رسم کہن ہے لیکن
آج یہ رسم ہی دہراؤ کہ کچھ رات کٹے
یوں تو تم روشنی قلب و نظر ہو لیکن
آج وہ معجزہ دکھلاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل دکھاتا ہے وہ مل کر بھی مگر آج کی رات
اُسی بے درد کو لے آؤ کہ کچھ رات کٹے
دم گھٹا جاتا ہے ہے افسردہ دلی سے یارو
کوئی افواہ ہی پھیلاؤ کہ کچھ رات کٹے
میں بھی بیکار ہوں اور تم بھی ہو ویران بہت
دوستو آج نہ گھر جاؤ کہ کچھ رات کٹے
چھوڑ آئے ہو سرشام اُسے کیوں ناصر
اُسے پھر گھر سے بلا لاؤ کہ کچھ رات کٹے

ناصر ناطقی



دفعۂ دل میں کسی یاد نے لی انگڑائی

دفعۂ دل میں کسی یاد نے لی انگڑائی
اس خرابے میں یہ دیوار کہاں سے آئی
آج کھلنے ہی کو تھا دردِ محبت کا بھرم
وہ تو کہیے کہ اچانک ہی تری یاد آئی
نشہِ تلخیِ ایام اترتا ہی نہیں
تیری نظروں نے گلابی تو بہت چھلکائی
یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی
یوں تو ملنے کو وہ ہر روز ہی ملتا ہے مگر
دیکھ کر آج اُسے آنکھ بہت للچائی
ڈوبتے چاند پہ روئی ہیں ہزاروں آنکھیں
میں تو رویا بھی نہیں تم کو ہنسی کیوں آئی
رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

ناصرِ قاضی



دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا

دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا
یاد نے کنکر پھینکا ہوگا
آج تو میرا دل کہتا ہے
تو اس وقت اکیلا ہوگا
میرے چومے ہوئے ہاتھوں سے
اوروں کو خط لکھتا ہوگا
بھیک چلیں اب رات کی پلمیں
تو اب تھک کے سویا ہوگا
ریل کی گہری سیٹی سن کر
رات کا جنگل گونجا ہوگا
شہر کے خالی اسٹیشن پر
کوئی مسافر اترا ہوگا
آنگن میں پھر چڑیاں بولیں
تو اب سو کر اٹھا ہوگا
یادوں کی جلتی شبنم سے
پھول سا مکھڑا دھویا ہوگا
موتی جیسی شکل بنا کر
آئینے کو تکتا ہوگا
شام ہوئی اب تو بھی شاید
اپنے گھر کو لوٹا ہوگا
نبلی دھندلی خاموشی میں
تاروں کی دھن سنتا ہوگا
میرا ساتھی شام کا تارا
تجھ سے آنکھ ملاتا ہوگا
شام کے چلتے ہاتھ نے تجھ کو
میرا سلام تو بھیجا ہوگا
پیاسی کر لاتی کونجوں نے
میرا دکھ تو سنایا ہوگا
میں تو آج بہت رویا ہوں
تو بھی شاید رویا ہوگا
ناصر تیرا میت پرانا
تجھ کو یاد تو آتا ہوگا

ناصر علی

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا
آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست
تو مصیبت میں عجب یاد آیا
دن گزارا تھا بڑی مشکل سے
پھر ترا وعدہ شب یاد آیا
تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا
مر رہیں گے اگر اب یاد آیا
پھر کئی لوگ نظر سے گزرے
پھر کوئی شہر طرب یاد آیا
حالِ دل ہم بھی سناتے لیکن
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا
بیٹھ کر سایہ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

ناصرِ ناظمی



دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے

دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے
زندگی تو ہی بتا کیسے جیا چاہیے
میری نوائیں الگ، میری دعائیں الگ
میرے لیے آشیاں سب سے جدا چاہیے
نرم ہے برگِ سمن، گرم ہے میرا سخن
میری غزل کے لیے ظرف نیا چاہیے
سر نہ کھپا اے جرس، مجھ کو مرا دل ہے بس
فرصتِ یک دو نفسِ مثل صبا چاہیے
باغِ ترا باغباں، تو ہے عبثِ بدگماں
مجھ کو تو اے مہرباں، تھوڑی سی جا چاہیے
خوب ہیں گل پھول بھی تیرے چمن میں مگر
صحنِ چمن میں کوئی نغمہ سرا چاہیے
ہے یہی عین وفا دل نہ کسی کا دکھا
اپنے بھلے کے لیے سب کا بھلا چاہیے
بیٹھے ہو کیوں ہار کے سائے میں دیوار کے
شاعرو، صورتِ گرو کچھ تو کیا چاہیے
مانو مری کاظمی تم ہو بھلے آدمی
پھر وہی آوارگی کچھ تو حیا چاہیے

ناصر کاظمی



دل میں آؤ عجیب گھر ہے یہ

دل میں آؤ عجیب گھر ہے یہ
عمرِ رفتہ کی رہگزر ہے یہ
سنگِ منزل سے کیوں نہ سر پھوڑیں
حاصلِ زحمتِ سفر ہے یہ
رنجِ غربت کے ناز اٹھاتا ہوں
میں ہوں اب اور دردِ سر ہے یہ
ابھی رستوں کی دھوپ چھاؤں نہ دیکھ
ہمسفر دور کا سفر ہے یہ
دن نکلنے میں کوئی دیر نہیں
ہم نہ سو جائیں اب تو ڈر ہے یہ
کچھ نئے لوگ آنے والے ہیں
گرم اب شہر میں خبر ہے یہ
اب کوئی کام بھی کریں ناصر
رونا دھونا تو عمر بھر ہے یہ

ناصر قاضی



دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی
یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آرہی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر کی رات جاگتی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

ناصر قاضی



دل میں اک ہوک سی اٹھی ہے ابھی

دل میں اک ہوک سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
کچھ تو نازم مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ سوچ بھی لگی ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈھتی ہے ابھی

ناصر قاضی



دل میں اور تو کیا رکھا ہے

دل میں اور تو کیا رکھا ہے
تیرا درد چھپا رکھا ہے
اتنے دکھوں کی تیز ہوا میں
دل کا دیپ جلا رکھا ہے
دھوپ سے چہروں نے دنیا میں
کیا اندھیر مچا رکھا ہے
اس نگری کے کچھ لوگوں نے
دکھ کا نام دوا رکھا ہے
وعدہ یار کی بات نہ چھیڑو
یہ دھوکا بھی کھا رکھا ہے
بھول بھی جاؤ بستی باتیں
ان باتوں میں کیا رکھا ہے
چپ چپ کیوں رہتے ہو ناصر
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے

ناصر ناظمی



دن پھر آئے ہیں باغ میں گل کے

دن پھر آئے ہیں باغ میں گل کے
بوئے گل ہے سُراغ میں گل کے
دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے
کیسی آئی بہار اب کے برس
بوئے خوں ہے ایام میں گل کے
اب تو روتوں میں خاک اڑتی ہے
سب کرشمے تھے باغ میں گل کے
آنسوؤں کے دیئے جلا ناصر
دم نہیں اب چراغ میں گل کے

ناصر قاضی



دن ڈھلا رات پھر آگئی، سو رہو سو رہو

دن ڈھلا رات پھر آگئی، سو رہو سو رہو
منزلوں چھا گئی خامشی، سو رہو سو رہو
سارا دن تپتے سورج کی گرمی میں جلتے رہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھر چلی سو رہو سو رہو
گرم سنسان قریوں کی دھرتی مہکنے لگی
خاک رشکِ ارم بن گئی سو رہو سو رہو
رزم گاہِ جہاں بن گئی جائے امن و اماں
ہے یہی وقت کی راگنی سو رہو سو رہو
کیسے سنسان ہیں آسماں چپ کھڑے ہیں مکاں
ہے فضا جنبی جنبی سو رہو سو رہو
تھک گئے ناقہ و سارباں، تھم گئے کارواں
گھٹیوں کی صدا سو گئی سو رہو سو رہو
چاندنی اور دھوئیں کے سوا دور تک کچھ نہیں
سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو
گردشِ وقت کی لوریاں رات کی رات ہیں
پھر کہاں یہ ہوا، یہ نمی سو رہو سو رہو
ساری بستی کے لوگ اس مدھر لے میں کھوئے گئے
دور بجنے لگی بانسری سو رہو سو رہو
دور شاخوں کے جھرمٹ میں جگنو بھی گم ہو گئے
چاند میں سو گئی چاندنی سو رہو سو رہو
گھر کے دیوار و در راہ تک تک کے شل ہو گئے
اب نہ آئے گا شاید کوئی سو رہو سو رہو
سُست رفتار تارے بھی آنکھیں جھپکنے لگے
غم کے مارو گھڑی دو گھڑی سو رہو سو رہو
منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل پڑے
دور ہے صبح روشن ابھی سو رہو سو رہو

ناصر کاظمی

دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر

دھواں سا ہے جو یہ آکاش کے کنارے پر
لگی ہے آگ کہیں رات سے کنارے پر
یہ کالے کوس کی پرہول رات ہے ساتھی
کہیں اماں نہ ملے گی تجھے کنارے پر
صدائیں آتی ہیں اُجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر
یہاں تک آئے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے
وہ رن پڑا ہے کہیں دوسرے کنارے پر
یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر
اس انقلاب کی شاید خبر نہ تھی اُن کو
جو ناؤباندھ کے سوتے رہے کنارے پر
ہیں گھات میں ابھی کچھ قافلے لٹیروں کے
ابھی جمائے رہو مورچے کنارے پر
پچھڑ گئے تھے جو طوفاں کی رات میں ناصر
سنا ہے اُن میں سے کچھ آملے کنارے پر

ناصر قاضی



دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا

دھوپ تھی اور بادل چھایا تھا
دیر کے بعد تجھے دیکھا تھا
میں اس جانب تو اس جانب
بیچ میں پتھر کا دریا تھا
ایک پیڑ کے ہاتھ تھے حنائی
اک ٹھہنی پر دیا جلا تھا
مجھ پر آگ حرام تھی لیکن
آگ نے اپنا کام کیا تھا

ناصر کاظمی



دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے

دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہو گئے
کیا تماشا ہے کہ بے ایام گل
پتیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
آنچ کھا لکھا کر صدائے رنگ کی
تتلیوں کے پر سنہرے ہو گئے
اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے

ناصر کاظمی



دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے

دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہو گئے
کیا تماشا ہے کہ بے ایام گل
ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
اس قدر رویا ہوں تیری یاد میں
آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے
ہم بھلا چپ رہنے والے تھے کہیں
ہاں مگر حالات ایسے ہو گئے
اب تو خوش ہو جائیں اربابِ ہوس
جیسے وہ تھے ہم بھی ویسے ہو گئے
حسن اب ہنگامہ آرا ہو تو ہو
عشق کے دعوے تو جھوٹے ہو گئے
اے سکوتِ شام غم یہ کیا ہوا
کیا وہ سب بیمار اچھے ہو گئے
دل کو تیرے غم نے پھر آواز دی
کب کے پچھڑے پھر اکٹھے ہو گئے
آو ناصر ہم بھی اپنے گھر چلیں
بند اس گھر کے درتچے ہو گئے

ناصر کاظمی



دور اس تیرہ خاکداں سے دور

دور اس تیرہ خاکداں سے دور
دیکھ دنیائے جسم و جاں سے دور
آنے والی بہار کے افسوں
دیکھ ویرانہ خزاں سے دور
پھول جلتے ہیں شائخوں سے جدا
شمع روتی ہے شمع داں سے دور
شہر خلق خدا سے بیگانہ
کارواں میر کارواں سے دور
تیرے زندانیوں کی کون سنے
برق چمکی ہے آشیاں سے دور
چینتی ہیں ڈراؤنی راتیں
چاند نکلا ہے آسماں سے دور
سو گیا پچھلی رات کا جادو
کوئی اب لے چلے یہاں سے دور
دل عجب گوشہ فراغت ہے
کیوں بھٹکتے ہو اس مکاں سے دور
کوئی سنتا نہیں یہاں ناصر
بات دل کی رہی زباں سے دور

ناصر کاظمی



دور فلک جب دہراتا ہے موسم گل کی راتوں کو

دور فلک جب دہراتا ہے موسم گل کی راتوں کو
کنجِ قفس میں سن لیتے ہیں بھولی ب سری باتوں کو
ریگِ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا
سونے صحرا چیخ اٹھتے ہیں آدھی آدھی راتوں کو
آتشِ غم کے سیل رواں میں نیندیں جل کر راکھ ہوئیں
پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو
مے خانے کا افسردہ ماحول تو یوں ہی تکتا ہے
خشک لبوں کی خیر مناؤ کچھ نہ کہو برساتوں کو
ناصر میرے منہ کی باتیں یوں تو سچے موتی ہیں
لیکن ان کی باتیں سن کر بھول گئے سب باتوں کو

ناصر کاظمی



دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا
وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمنان ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا
جدائیوں کے زخمِ دردِ زندگی نے بھر دیے
تجھے بھی نیند آگئی مجھے بھی صبر آگیا
پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمین نکل گئی انہیں کہ آسمان کھا گیا
یہ صبح کی سفیدیاں یہ دوپہر کی زردیاں
اب آئینے میں دیکھتا ہوں میں کہاں چلا گیا
یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آگئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا
گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشتو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آگیا

ناصرِ قاضی



دیس سبز جھلیوں کا

دیس سبز جھلیوں کا
یہ سفر ہے میلوں کا
راہ میں حبزیروں کی
سلسلہ ہے ٹیلوں کا
کشتیوں کی لاشوں پر
جگمگاتا ہے چیلوں کا
رنگ اڑتا جاتا ہے
شہر کی فصیلوں کا
دیکھ کر چلو ناصر
دشت ہے یہ فیلوں کا

ناصر قاضی



دیکھ مجھت کا دستور

دیکھ مجھت کا دستور
تو مجھ سے میں تجھ سے دور
تہا تہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نور
دوست بچھڑتے جاتے ہیں
شوق لیے جاتا ہے دور
ہم اپنا غم بھول گئے
آج کسے دیکھا مجبور
دل کی دھڑکن کہتی ہے
آج کوئی آئے گا ضرور
کوشش لازم ہے پیارے
آگے جو اس کو منظور
سورج ڈوب چلا ناصر
اور ابھی منزل ہے دور

ناصر قاضی



رات ڈھل رہی ہے

رات ڈھل رہی ہے
ناؤ چل رہی ہے
برف کے نگر میں
آگ جل رہی ہے
لوگ سو رہے ہیں
رت بدل رہی ہے
آج تو یہ دھرتی
خوں اگل رہی ہے
خواہشوں کی ڈالی
ہاتھ مل رہی ہے
جہلوں کی کھیتی
پھول پھل رہی ہے

ناصر نظامی



رقم کریں گے ترا نام انتسابوں میں

رقم کریں گے ترا نام انتسابوں میں
کہ انتخابِ سخن ہے یہ انتخابوں میں
مری بھری ہوئی آنکھوں کو چشمِ کم سے نہ دیکھ
کہ آسمان مقید ہیں ان حبابوں میں
ہر آن دل سے الجھتے ہیں دو جہان کے غم
گھرا ہے ایک کبوتر کئی عقابوں میں
ذرا سنو تو سہی کان دھر کے نالہ دل
یہ داستاں نہ ملے گی تمہیں کتابوں میں
نئی بہار دکھاتے ہیں داغِ دل ہر روز
یہی تو وصف ہے اس باغ کے گلابوں میں
پون چلی تو گل و برگ دف بجانے لگے
اداس خوشبوئیں لو دے اٹھیں نقابوں میں
ہوا چلی تو کھلے بادبانِ طبع رسا
سفینے چلنے لگے یاد کے سراپوں میں
کچھ اس ادا سے اڑا جا رہا ہے ابلق رنگ
صبا کے پاؤں ٹھہرتے نہیں رکابوں میں
بدلتا وقت یہ کہتا ہے ہر گھڑی ناصر
کہ یادگار ہے یہ وقت انقلابوں میں

ناصر کاظمی



رنگ برسات نے بھرے کچھ تو

رنگ برسات نے بھرے کچھ تو
زخمِ دل کے ہرے کچھ تو
فرصتِ بے خودی غنیمت ہے
گردشیں ہو گئیں پرے کچھ تو
کتنے شوریدہ سر تھے پروانے
شام ہوتے ہی جل مرے کچھ تو
ایسا مشکل نہیں ترا ملنا
دل مگر جستجو کرے کچھ تو
آؤ ناصر کوئی غزل چھیڑیں
جی بہل جائے گا اے کچھ تو

ناصر قاضی



رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے، سونا ہوّ رخسار بھی
درد کے جھونکوں نے اب کی دل ہی ٹھنڈا کر دیا
آگ برساتا تھا آگے دیدہ خوں بار بھی
بیٹھے بیٹھے جانے کیوں بیتاب ہو جاتا ہے دل
پوچھتے کیا ہو میاں، اچھا بھی ہوں بیمار بھی
شوقِ آزادی لئے جاتا ہے منزل سے پرے
روکتی ہے ہر قدم آوازِ پائے یار بھی
سادگی سے تم نہ سمجھے ترکِ دنیا کا سبب
ورنہ وہ درویش تھے پردے میں دنیا دار بھی
کس طرح گزرے گا ناصر فرصتِ ہستی کا دن
جم گیا دیوار بن کر سایہ دیوار بھی

ناصر کاظمی



رنگ صبحوں کے راگ شاموں کے

رنگ صبحوں کے راگ شاموں کے
جیسے سپنا کوئی اداس اداس
کیسا سنسان ہے سحر کا سماں
پتیاں محو یاس، گھاس اداس
خیر ہو شہر شبنم و گل کی
کوئی پھرتا ہے آس پاس اداس
بیٹھے بیٹھے برس پڑیں آنکھیں
کر گئی پھر کسی کی آس اداس
کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے
لیے پھرتی ہے کوئی باس اداس
مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
اور کچھ دن پھرو اداس اداس
صبح ہونے کو ہے اٹھو ناصر
گھر میں بیٹھے ہو کیوں نراس اداس

ناصر قاضی



رہ نورِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر

رہ نورِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر
بے نشان ہے سفرِ رات ساری پڑی ہے مگر
آ رہی ہے صدا دم بدم صبر کر صبر کر
تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہم لے ستم صبر کر صبر کر
تیرے قدموں سے جاگیں گے اُڑے دلوں کے ختن
پا شکستہ غزالِ حرم صبر کر صبر کر
شہرِ اجڑے تو کیا ہے کشادہ زمینِ خدا
اک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر
یہ محلاتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کر صبر کر
دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم صبر کر صبر کر
لہلہائیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں
کھل کے برسے گا ابر کرم صبر کر صبر کر
کیوں پکلتا ہے سرِ سنگ سے جی جلا ڈھنگ سے
دل ہی بن جائے گا خود صنم صبر کر صبر کر
پہلے کھل جائے دل کا کنول پھر لکھیں گے غزل
کوئی دم اے صریرِ قلم صبر کر صبر کر
درد کے تار ملنے تو دے ہونٹ ہلنے تو دے
ساری باتیں کریں گے رقم صبر کر صبر کر
دیکھ ناصر زمانے میں کوئی کسی کا نہیں
بھول جا اُس کے قول و قسم صبر کر صبر کر

ناصرِ ظہری

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
اب کی فصل بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ
دل ترے بعد سو گیا ورنہ
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ

ناصر کاظمی



زباں سخن کو سخن بانگین کو ترسے گا

زباں سخن کو سخن بانگین کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرز سخن کو ترسے گا
نئے پیالے سہی تیرے دور میں ساقی
یہ دور میری شراب کہن کو ترسے گا
مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا
انہی کے دم سے فروزاں ہیں ملتوں کے چراغ
زمانہ صحبتِ اربابِ فن کو ترسے گا
بدل سکو تو بدل دو یہ باغباں ورنہ
یہ باغ سایہ سرو سمن کو ترسے گا
ہوئے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو، سورج کرن کو ترسے گا

ناصر کاظمی



زندگی بھروفا ہمیں سے ہوئی

زندگی بھر وفا ہمیں سے ہوئی
سچ ہے یارو خطا ہمیں سے ہوئی
دل نے ہر داغ کو رکھا محفوظ
یہ زمیں خوشنما ہمیں سے ہوئی
ہم سے پہلے زمین شہر وفا
خاک تھی کیا ہمیں سے ہوئی
کتنی مردم شناس ہے دنیا
منحرف بے حیا ہمیں سے ہوئی
کون اٹھاتا شبِ فراق کے ناز
یہ بلا آشنا ہمیں سے ہوئی
بے غرض کون گنواتا ہے
تیری قیمت ادا ہمیں سے ہوئی
ستم ناروا تجھی سے ہوا
تیرے حق میں دعا ہمیں سی ہوئی
سعیِ تجدید دوستی ناصر
آج کیا بارہا ہمیں سے ہوئی
رنگِ منت کش آواز نہیں
گل بھی ہے ایک نوا غور سے سُن
خامشی حاصلِ موسیقی ہے
نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سُن
آنند دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمہٴ آبِ صفا غور سے سُن
عشق کو حُسن سے خالی نہ سمجھ
نالہ اہل وفا غور سے سُن
دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سُن
ہر قدم راہِ طلب میں ناصر
جس دل کی صدا غور سے سُن

ناصر ظہیری

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن
دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سُن
چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سُن
یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شورِ درا غور سے سُن
ہر نفس دامِ گرفتاری ہے
تو گرفتارِ بلا غور سے سُن
دل تڑپتا ہے کیوں آخرِ شب
دو گھڑی کان لگا غور سے سُن
اسی منزل میں ہیں سب ہجر و وصال
رہروِ آبلہ پا غور سے سُن
اسی گوشے میں ہیں سب دیر و حرم
دل صنم ہے کہ خدا غور سے سُن
!کعبہ سنسان ہے کیوں اے واعظ
ہاتھ کانوں سے اٹھا غور سے سُن
موت اور زیست کے اسرار و رموز
آمری بزم میں آ غور سے سُن
کیا گزرتی ہے کسی کے دل پر
تو بھی اے جانِ وفا غور سے سُن
کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ بہال
شبِ گزیدوں کی دعا غور سے سُن
ہے یہی ساعتِ ایجاب و قبول
صبح کی لے کو ذرا غور سے سُن
کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سنا ہے صبا غور سے سُن
برگِ آوارہ بھی اک مطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سُن

ناصر کٹھنی

سرِ مقتل بھی صدا دی ہم نے

سرِ مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سنا دی ہم نے
پہلے اک روزِ در توڑا ہوتا
اب کے بنیاد ہلا دی ہم نے
پھر سر صبح وہ قصہ چھیڑا
دن کی قندیل بجھا دی ہم نے
آتش غم کے شرارے چن کر
آگِ زنداں میں لگا دی ہم نے
رہ گئے دستِ صبا کھلا کر
پھول کو آگِ پلا دی ہم نے
آتش گل ہو کہ ہو شعلہ ساز
جلنے والوں کو ہوا دی ہم نے
کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینے نے میں چھپا دی ہم نے
دم مہتاب فشاں سے ناصر
آج تو رات جگا دی ہم نے

ناصر قاضی



سر میں جب عشق کا سودا نہ رہا

سر میں جب عشق کا سودا نہ رہا
کیا کہیں زیست میں کیا کیا نہ رہا
اب تو دنیا بھی وہ دنیا نہ رہی
اب ترا دھیان بھی اتنا نہ رہا
قصہ شوق سناؤں کس کو
راز داری کا زمانا نہ رہا
زندگی جس کی تمنا میں کٹی
وہ مرے حال سے بیگانہ رہا
ڈیرے ڈالے ہیں خزاں نے چوندیس
گل تو گل، باغ میں کانٹا نہ رہا
دن دہاڑے یہ لہو کی ہولی
خلق کو خوف خدا کا نہ رہا
اب تو سو جاؤ ستم کے مارو
آسمان پر کوئی تارا نہ رہا

ناصر قاضی



سفر منزلِ شب یاد نہیں

سفر منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں
اویں قُرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں
دل میں ہر وقت چھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں
وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
کیسی ویراں ہے گزرگاہ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں
بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں
ایسا اُلجھا ہوں غم دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں
رشمہ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں
یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں
یاد ہے سیر چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

ناصر کاظمی



سناتا ہے کوئی بھولی کہانی

سناتا ہے کوئی بھولی کہانی
مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی
یہاں جنگل تھے آبادی سے پہلے
سنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی
یہاں اک شہر تھا شہر نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی
میں وہ دل ہوں دبستانِ الم کا
جسے روئے گی صدیوں شادمانی
تصور نے اُسے دیکھا ہے اکثر
خرد کہتی ہے جس کو لا مکانی
خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے
بسا لیتا ہوں اک دنیا سہانی
ہجومِ تشہرِ فکرِ سخن میں
بدل جاتے ہیں لفظوں کے معانی
بتا اے ظلمتِ صحرائے امکاں
کہاں ہوگا مرے خوابوں کا ثانی
اندھیری شام کے پردوں میں چھپ کر
کسے روتی ہے چشموں کی روانی
کرن پریاں اترتی ہیں کہاں سے
کہاں جاتے ہیں رستے کہکشانِ
پہاڑوں سے چلی پھر کوئی آندھی
اڑے جائے ہیں اوراقِ خزانِ
نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

ناصر کاظمی



سوگنی شہر کی ہر ایک گلی

سو گئی شہر کی ہر ایک گلی
اب تو آجا کہ رات بھیگ چلی
کوئی جھونکا چلا تو دل دھڑکا
دل دھڑکتے ہی تیری یاد آئی
کون ہے تو کہاں سے آیا ہے
کہیں دیکھا ہے تجھ کو پہلے بھی
تو بتا کیا تجھے ثواب ملا
خیر میں نے تو رات کاٹ ہی لی
مجھ سے کیا پوچھتا ہے میرا حال
سامنے ہے ترے کتاب کھلی
میرے دل سے نہ جا خدا کے لیے
ایسی بستی نہ پھر بے کبھی
میں اسی غم میں گھلتا جاتا ہوں
کیا مجھے چھوڑ جائے گا تو بھی
ایسی جلدی بھی کیا ، چلے جانا
مجھے اک بات پوچھنی ہے ابھی
آبھی جا میرے دل کے صدر نشین
کب سے خالی پڑی ہے یہ کرسی
میں تو ہلکان ہو گیا ناصر
مدت ہجر کتنی پھیل گئی

ناصر کاظمی



شبم آلود پک یاد آئی

شبم آلود پک یاد آئی
گل عارض کی جھلک یاد آئی
پھر سلگنے لگے یادوں کے کھنڈر
پھر کوئی تاکِ صنک یاد آئی
کبھی زلفوں کی گھٹا نے گھیرا
کبھی آنکھوں کی چمک یاد آئی
پھر کسی دھیان نے ڈیرے ڈالے
کوئی آوارہ مہک یاد آئی
پھر کوئی نغمہ گلو گیر ہوا
کوئی بت نام کسک یاد آئی
ذّرے پھر مائل رم ہیں ناصر
پھر اُنھیں سیر فلک یاد آئی

ناصری نظمیں



شعاعِ حسن ترے حسن کو چھپاتی تھی

شعاعِ حسن ترے حسن کو چھپاتی تھی
وہ روشنی تھی کہ صورت نظر نہ آتی تھی
کسے ملیں کہاں جائیں کہ رات کالی ہے
وہ شکل ہی نہ رہی جو دیے جلاتی تھی
وہ تو دن تھے حقیقت میں عمر کا حاصل
خوشا وہ دن کہ ہمیں روز موت آتی تھی
ذرا سی بات سہی تیرا یاد آجانا
ذرا سی بات بہت دیر تک رلاتی تھی
اداس بیٹھے ہو کیوں ہاتھ توڑ کر ناصر
وہ نے کہاں ہے جو تاروں کی نیند اڑاتی تھی

ناصر کاظمی



شعلہ سا پیچ و تاب میں دیکھا

شعلہ سا پیچ و تاب میں دیکھا
جانے کیا اضطراب میں دیکھا
گل کدوں کے طلسم بھول گئے
وہ تماشا نقاب میں دیکھا
آج ہم نے تمام حسن بہار
ایک برگِ گلاب میں دیکھا
سر کھلے، پابرہنہ، کھوٹے پر
رات اُسے ماہتاب میں دیکھا
فرصتِ موسمِ نشاط نہ پوچھ
جیسے اک خواب، خواب میں دیکھا

ناصر قاضی



شکوہ بہ طرزِ عام نہیں آپ سے مجھے

شکوہ بہ طرزِ عام نہیں آپ سے مجھے
ناکام ہوں کہ کام نہیں آپ سے مجھے
کہتا، سلوک آپ کے ایک ایک سے مگر
مطلوب انتقام نہیں آپ سے مجھے
اے منصفو حقائق و حالات سے الگ
کچھ بحث خاص و عام نہیں آپ سے مجھے
یہ شہر دل ہے شوق سے رہیے یہاں مگر
امید انتظام نہیں آپ سے مجھے
فرصت ہے اور شام بھی گہری ہے کس قدر
اس وقت کچھ کلام نہیں آپ سے مجھے

ناصر قاضی



شہر در شہر گھر جلائے گئے

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے
آہ وہ خلوتوں کے سرمائے
مجمع عام میں لٹائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہائے گئے

ناصر کاظمی



شہر سنسان ہے کدھر جائیں

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں
رات کتنی گزر گئی لیکن
اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں
یوں ترے دھیان سے لرزتا ہوں
جیسے پتے ہوا سے ڈر جائیں
اُن اجالوں کی دھن میں پھرتا ہوں
چھب دکھاتے ہی جو گزر جائیں
رین اندھیری ہے اور کنارہ دور
چاند نکلے تو پار اتر جائیں

ناصر قاضی



شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے

شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے
دل تجھے بھی بھلائے جاتا ہے
اگلے وقتوں کی یادگاروں کو
آسمان کیوں مٹائے جاتا ہے
سوکھتے جارہے ہیں گل بوٹے
باغ کانٹے اگلے جاتا ہے
جاتے موسم کو کس طرح روکوں
پتہ پتہ اڑائے جاتا ہے
حال کس سے کہوں کہ ہر کوئی
اپنی اپنی سنائے جاتا ہے
کیا خبر کون سی خوشی کے لیے
دل یونہی دن گنوائے جاتا ہے
رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصر
تجھے کیا رنج کھائے جاتا ہے

ناصر ناطقی



صبح کا تارا ابھر کر رہ گیا

صبح کا تارا ابھر کر رہ گیا
رات کا جادو بکھر کر رہ گیا
ہم سفر سب منزلوں سے جا ملے
میں نئی راہوں میں مر کر رہ گیا
کیا کہوں اب تجھ سے اے جوئے کم آب
میں بھی دریا تھا اتر کر رہ گیا

فاصلہ ناظمی



صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری

صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری
نگاہِ شوق کس منزل سے گزری
کبھی روئے کبھی تجھ کو پکارا
شبِ فرقت بڑی مشکل سے گزری
ہوائے صبح نے چونکا دیا یوں
تری آواز جیسے دل سے گزری
مرا دل خو گرِ طوفاں ہے ورنہ
یہ کشتی بارہا ساحل سے گزری

ناصر قاضی



عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا

عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا
حسن خود محو تماشا ہوگا
سُن کے آوازہ زنجیر صبا
قفس غنچہ کا در وا ہوگا
جرس شوق اگر ساتھ رہی
ہر نفس شہپر عنقا ہوگا
دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا
کون دیکھے گا طلوع خورشید
ذرہ جب دیدہ پینا ہوگا
ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کیا ہوگا
پھر سلگنے لگا صحرائے حیات
ابر گھر کر کہیں برسا ہوگا
پھر کسی دھیان کے صد راہے ہر
دل حیرت زدہ تنہا ہوگا
پھر کسی صبح طرب کا جادو
پردہ شب سے ہویدا ہوگا
گل زمینوں کے ٹٹک رمون میں
جشن رامش گری برپا ہوگا
پھر نئی رُت کا اشارہ پا کر
وہ سمن بو چن آرا ہوگا
گل شب تاب کی خوشبو لے کر
ابلق صبح روانہ ہوگا
پھر سر شاخ شعاع خورشید
نکبت کُل کا بسیرا ہوگا
اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی
اک شرر پھول میں لرزا ہوگا
دیکھ کر آنینہ آپ رواں
پتہ پتہ لب گویا ہوگا
شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

ناصر قاضی



عشق میں جیت ہوئی یا مات

عشق میں جیت ہوئی یا مات
آج کی رات نہ چھیڑ یہ بات
یوں آیا وہ جانِ بہار
جیسے جگ میں پھیلے بات
رنگ کھلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات
کچھ نہ کہا اور کچھ نہ سنا
دل میں رہ گئی دل کی بات
یار کی نگری کوسوں دور
کیسے کٹے گی بھاری رات
بستی والوں سے چھپ کر
رو لیتے ہیں پچھلی رات
سناٹوں میں سنتے ہیں
سُنی سنائی کوئی بات
پھر جاڑے کی رُت آئی
چھوٹا دن اور لمبی رات

ناصر قاضی



غم ہے یا خوشی ہے تو

غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو
آفتوں کے دور میں
چپین کی گھڑی ہے تو
میری رات کا چراغ
میری نیند بھی ہے تو
میں حنا کی شام ہوں
رُت بہار کی ہے تو
دوستوں کے درمیاں
وہ دوستی ہے تو
میری ساری عمر میں
ایک ہی کمی ہے تو
میں تو وہ نہیں رہا
ہاں مگر وہی ہے تو
ناصر اس دیار میں
کتنا اجنبی ہے تو

ناصر قاضی



فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے

فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے
خوفِ بے مہرِ خزاں بھی ہے
خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں
آمدِ صبح کا سماں بھی ہے
رنگ بھی اڑ رہا ہے پھولوں کا
غنجہ غنجہ شررِ فشاں بھی ہے
اوس بھی ہے کہیں کہیں لرزاں
بزمِ انجم دھواں دھواں بی ہے
کچھ تو موسم بھی ہے خیالِ انگیز
کچھ طبیعت مری رواں بھی ہے
کچھ ترا حسن بھی ہے ہوش ربا
کچھ مری شوخی بیاں بھی ہے
ہر نفس شوق بھی ہے منزل کا
ہر قدم یادِ رفتگاں بھی ہے
وجہِ تسکین بھی ہے اس کا خیال
حد سے بڑھ جائے تو گراں بھی ہے
زندگی جس کے دم سے ہے ناصر
یاد اس کی عذابِ جاں بھی ہے

ناصرِ قاضی



قصے ہیں خموشی میں نہاں اور طرح کے

قصے ہیں خموشی میں نہاں اور طرح کے
ہوتے ہیں غمِ دل کے بیاں اور طرح کے
تھی اور ہی کچھ بات کہ تھا غم بھی گوارا
حالات ہیں اب درپے جاں اور طرح کے
اے راہرو راہِ وفا دیکھ کے چلنا
اس راہ میں ہیں سنگِ گراں اور طرح کے
کھٹکا ہے جدائی کا نہ ملنے کی تمنا
دل کو ہیں مرے وہم و گماں اور طرح کے
پر سال تو کلیاں ہی جھڑی تھیں مگر اب کے
گلشن میں ہیں آثارِ خزاں اور طرح کے
دنیا کو نہیں تاب مرے درد کی یارب
دے مجھ کو اسالیبِ فغاں اور طرح کے
ہستی کا بھرم کھول دیا ایک نظر نے
اب اپنی نظر میں ہیں جہاں اور طرح کے
لشکر ہے نہ پرچم ہے نہ دولت ہے نہ ثروت
ہیں خاک نشینوں کے نشاں اور طرح کے
مرتا نہیں اب کوئی کسی کے لیے ناصر
تھے اپنے زمانے کے جواں اور طرح کے

ناصر قاضی



قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں

قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں
ہر اک سانس کو ہم صبا جانتے ہیں
لہو رو کے سینچا ہے ہم نے چمن کو
ہر اک پھول کا ماجرا جانتے ہیں
جسے نغمہ نے سمجھتی ہے دنیا
اُسے بھی ہم اپنی صدا جانتے ہیں
اشارا کرے جو نئی زندگی کا
ہم اُس خود کشی کو روا جانتے ہیں
تری دھُن میں کوسوں سفر کرنے والے
تجھے سنگِ منزل نما جانتے ہیں

ناصر کاظمی



قہر سے دیکھ نہ ہر آن مجھے

قہر سے دیکھ نہ ہر آن مجھے
آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے
یک بیک آ کے دکھا دو جھمکی
کیوں پھراتے ہو پریشان مجھے
ایک سے ایک نئی منزل میں
لیے پھرتا ہے ترا دھیان مجھے
سُن کے آوازہ گل کچھ نہ سنا
بس اسی دن سے ہوئے کان مجھے
جی ٹھکانے نہیں جب سے ناصر
شہر لگتا ہے بیابان مجھے

ناصر کاظمی



کب تک بیٹھے ہاتھ ملیں

کب تک بیٹھے ہاتھ ملیں
چل سا تھی کہیں اور چلیں
اب کس گھاٹ پہ باندھیں ناؤ
اب یہ طوفان کیسے ٹلیں
اب یہ مانگیں کون بھرے
اب یہ پودے کیسے پھلیں
جگ جگ جنیں مرے سا تھی
جلنے والے اور جلیں
تجھ کو چپین ملے ناصر
تیرے دکھ گیتوں میں ڈھلیں

ناصر کاظمی



کبھی کبھی تو جذبِ عشق مات کھا کے رہ گیا

کبھی کبھی تو جذبِ عشق مات کھا کے رہ گیا
کہ تجھ سے مل کے بھی ترا خیال آ کے رہ گیا
جدائیوں کے مرحلے بھی حُسن سے تہی نہ تھے
کبھی کبھی تو شوق آئے دکھا کے رہ گیا
کسے خبر کہ عشق پر قیامتیں گزر گئیں
زمانہ اس نگاہ کا فریب کھا کے رہ گیا
یہ کیا مقامِ شوق ہے، نہ آس ہے کہ یاس ہے
یہ کیا ہوا کہ لب پہ تیرا نام آ کے رہ گیا
کوئی بھی ہم سفر نہ تھا شریکِ منزلِ جنوں
بہت ہوا تو رفتگاں کا دھیان آ کے رہ گیا
چراغِ شامِ آرزو بھی جھللا کے رہ گئے
ترا خیال راستے سُجھا سُجھا کے رہ گیا
چمک چمک کے رہ گئیں نجوم و گل کی منزلیں
میں درد کی کہانیاں سنا سنا کے رہ گیا
ترے وصال کی امید اشک بن کے بہہ گئی
خوشی کا چاند شام ہی سے جھللا کے رہ گیا
وہی اداس روز و شب، وہی فسوں، وہی ہوا
ترے وصال کا زمانہ یاد آ کے رہ گیا

ناصر کاظمی



کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے
اب تو جھونکے سے لرز اٹھتا ہوں
نشہِ خوابِ گراں تھا پہلے
اب تو منزل بھی ہے خود گرم سفر
ہر قدمِ سنگِ نشاں تھا پہلے
سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے
یہ الگ بات کہ غمِ راس ہے اب
اس میں اندیشہِ جاں تھا پہلے
یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دلِ عجب کنجِ اماں تھا پہلے
اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے
ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اُس طرف چشمہِ رواں تھا پہلے
اب وہ دریا، نہ وہ بستی، نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آبادِ مکاں تھا پہلے
اُڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور
سرو ایک شوخِ جواں تھا پہلے
کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے
ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے
ہم نے بخشی ہے نموشی کو زباں
دردِ مجبورِ فغاں تھا پہلے
ہم نے ایجاد کیا تیشہِ عشق
شعلہِ پتھر میں نہاں تھا پہلے
ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار
عطرِ گلِ صرفِ خزاں تھا پہلے
غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہِ برباد کہاں تھا پہلے

ناصر کاظمی

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں
یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچہِ دلبر ہی چلیں
یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں
اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

ناصر قاضی



کرتا اسے بے قرار کچھ دیر

کرتا اسے بے قرار کچھ دیر
ہوتا اگر اختیار کچھ دیر
کیا روئیں فریبِ آسمان کو
اپنا نہیں اعتبار کچھ دیر
آنکھوں میں کٹی پہاڑ سی رات
سو جا دلِ بے قرار کچھ دیر
اے شہرِ طرب کو جانے والو
کرنا مرا انتظار کچھ دیر
بے کیفی روز و شب مسلسل
سر مستی انتظار کچھ دیر
تکلیفِ غم فراق دائم
تقریبِ وصالِ یار کچھ دیر
یہ غنچہ و گل ہیں سب مسافر
ہے قافلہ بہار کچھ دیر
دنیا تو سدا رہے گی ناصر
ہم لوگ ہیں یادگار کچھ دیر

ناصر قاضی



کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے

کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے
آج تو شام بھی سحر سی ہے
اہل غم ہیں کہ صبح کی تصویر
دل بجھا سا ہے آنکھ ترسی ہے
کیوں نہ کھینچے دلوں کو ویرانہ
اُس کی صورت بھی اپنے گھر کی سی ہے
بے ثمر ہی سہی ہے شاخِ مراد
برف پگھلی تو آگ برسی ہے
ال میں اب کیا رہا ہے تیرے بعد
ایک سنسان رہ گزر سی ہے
صبح تک ہم نہ سو سکے ناصر
رات بھر کتنی اوس برسی ہے

ناصر کاظمی



کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جس گل اداس کر کے مجھے
میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے
میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے
میں تیرے درد کی طغیانوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے
ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہی راتوں میں عمر بھر کے مجھے
ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غم دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے
پھر آج آئی تھی اک موجہ ہوائے طرب
ستا گئی ہے فسانے ادھر ادھر کے مجھے

ناصر ناطقی



کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے

کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے
وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جائے
مری بربادیوں پر رونے والے
تجھے محوِ فغاں دیکھا نہ جائے
زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے
سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غم صد کارواں دیکھا نہ جائے
کہیں آگ اور کہیں شعلوں کے انبار
بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے
در و دیوار ویراں شمعِ مدھم
شبِ غم کا سماں دیکھا نہ جائے
پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
بھری برسات خالی جا رہی ہے
سرِ ابرِ رواں دیکھا نہ جائے
کہیں تم، اور کہیں ہم، کیا غضب ہے
فراقِ جسم و جاں دیکھا نہ جائے
وہی جو حاصلِ ہستی ہے ناصر
اُسی کو مہرباں دیکھا نہ جائے

ناصر کاظمی



کل جنہیں زندگی تھی راس بہت

کل جنہیں زندگی تھی راس بہت
آج دیکھا انہیں اداس بہت
رفتگاں کا نشان نہیں ملتا
اُگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت
کیوں نہ روؤں تری جدائی میں
دن گزرتے ہیں تیرے پاس بہت
چھاؤں مل جائے دامن گل کی
ہے غریبی میں یہ لباس بہت
وادی دل میں پاؤں دیکھ کے رکھ
ہے یہاں درد کی اُگاس بہت
سوکھے پتوں کو دیکھ کر ناصر
یاد آتی ہے گل کی باس بہت

ناصر کاظمی



کم فرصتی خوابِ طرب یاد رہے گی

کم فرصتی خوابِ طرب یاد رہے گی
گزری جو ترے ساتھ، وہ شب یاد رہے گی
ہر چند ترا عہدِ وفا بھول گئے ہم
وہ کشمکشِ صبرِ طلب یاد رہے گی
سینے میں امنگوں کا وہی شور ہے اب تک
وہ شوخی یک جنبشِ لب یاد رہے گی
پھر جس کے تصور میں برسنے لگیں آنکھیں
وہ برہمیِ صحبتِ شب یاد رہے گی
گو ہجر کے لمحات بہت سخت تھے لیکن
ہر بات بعنوانِ طرب یاد رہے گی

ناصر قاضی



سُنج سُنج نغمہ زن بسنت آگئی

سُنج سُنج نغمہ زن بسنت آگئی
یاب سچے گی انجمن بسنت آگئی
اڑ رہے ہیں شہر میں پتنگ رنگ رنگ
جگمگا اٹھا گگن بسنت آگئی
موہنے لبھانے والے پیارے پیارے لوگ
دیکھنا چمن چمن بسنت آگئی
سبز کھیتیوں پہ پھر نکھار آگیا
لے کے زرد پیرہن بسنت آگئی
بچھلے سال کے ملال دل سے مٹ گئے
لے کے پھر نئی چھن بسنت آگئی

ناصر کاظمی



کہاں گئے وہ سخنور جو میر محفل تھے

کہاں گئے وہ سخنور جو میر محفل تھے
ہمارا کیا ہے بھلا ہم کہاں کے کامل تھے
بھلا ہوا کہ ہمیں یوں بھی کوئی کام نہ تھا
جو ہاتھ ٹوٹ گئے ٹوٹنے کے قابل تھے
حرام ہے جو صراحی کو منہ لگایا ہو
یہ اور بات کہ ہم بھی شریکِ محفل تھے
گزر گئے ہیں جو خوشبوئے رائگاں کی طرح
وہ چند روز مری زندگی کا حاصل تھے
پڑے ہیں سایہ گل میں جو سرخرو ہو کر
وہ جاں نثار ہی اے شمع تیرے قاتل تھے
اب اُن سے دور کا بھی واسطہ نہیں ناصر
وہ ہم نوا جو مرے رتجگوں میں شامل تھے

ناصر کاظمی



کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در

کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در
یہ وہی دیار ہے دوستو جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر
میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یو نہی شہر شہر نگر نگر
کہاں کھو گیا مرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر
جنہیں زندگی کا شعور تھا انہیں بے زری نے بچھا دیا
جو گراں تھے سینہ چاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر
مری بیکسی کا نہ غم کرو مگر اپنا فائدہ سوچ لو
تمہیں جس کی چھاؤں عزیز ہے میں اُسی درخت کا ہوں ثمر
یہ بجا ہے آج اندھیرا ہے ذرا رت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

ناصر قاضی



کوئی جیے یا کوئی مرے

کوئی جیے یا کوئی مرے
تم اپنی سی کر گزرے
دل میں تیری یادوں نے
کیسے کیسے رنگ بھرے
اب وہ امنگیں ہیں نہ وہ دل
کون اب تجھ کو یاد کرے
پیار کی ریت نرالی ہے
کوئی کرے اور کوئی بھرے
پھول تو کیا کانٹے بھی نہیں
کیسے اُبڑے باغ ہرے
بادل گرجا پون چلی
پھلواڑی میں پھول ڈرے
پت جھڑ آنے والی ہے
رس پی کر اڑ جا مہنورے

ناصر ناطقی



کوئی اور ہے نہیں تو نہیں مرے روبرو کوئی اور ہے

کوئی اور ہے نہیں تو نہیں مرے روبرو کوئی اور ہے
بڑی دیر میں تجھے دیکھ کر یہ لگا کہ تو کوئی اور ہے
یہ گناہگاروں کی سرزمین ہے بہشت سے بھی سوا حسین
مگر اس دیار کی خاک میں سببِ نمو کوئی اور ہے
جسے ڈھونڈتا ہوں گلی گلی وہ ہے میرے جیسا ہی آدمی
مگر آدمی کے لباس میں وہ فرشتہ خو کوئی اور ہے
کوئی اور شے ہے وہ بے خبر جو شراب سے بھی ہے تیز تر
مرا میکدہ کہیں اور ہے مرا ہم سب کوئی اور ہے

ناصر کاظمی



کون اس راہ سے گزرتا ہے

کون اس راہ سے گزرتا ہے
دل یوں ہی انتظار کرتا ہے
دیکھ کر بھی نہ دیکھنے والے
دل تجھے دیکھ دیکھ ڈرتا ہے
شہر گل میں کٹی ہے ساری رات
دیکھیے دن کہاں گزرتا ہے
دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر قاضی



کیا دن مجھے عشق نے دکھائے

کیا دن مجھے عشق نے دکھائے
اک بار جو آئے پھر نہ آئے
اُس پیکرِ ناز کا فسانہ
دل ہوش میں آئے تو سنائے
وہ روحِ خیال و جانِ مضمون
دل اس کو کہاں سے ڈھونڈ لائے
آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر
عارض کہ شراب تھر تھرائے
مہکی ہوئی سانس نرم گفتار
ہر ایک روش پہ گل کھلائے
راہوں پہ ادا ادا سے رقصاں
آنچل میں حیا سے منہ چھپائے
اُڑتی ہوئی زلف یوں پریشاں
جیسے کوئی راہ بھول جائے
کچھ پھول برس پڑے زمیں پر
کچھ گیت ہوا میں لہلہائے

ناصر نظامی



کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے
جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے
کر دیا آج زمانے نے انہیں بھی مجبور
کبھی یہ لوگ مرے دکھ کی دوا کرتے تھے
دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اُس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے
اتفاقاتِ زمانہ بھی عجب ہیں ناصر
آج وہ دیکھ رہے ہیں جو سنا کرتے تھے

ناصر قاضی



کیا لگے آنکھ پھر دل میں سمایا کوئی

کیا لگے آنکھ پھر دل میں سمایا کوئی
رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سمایا کوئی
فکر یہ تھی کہ شب ہجر کٹے گی کیوں کر
لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی
شوق یہ تھا کہ محبت میں جلیں گے چپ چاپ
رنج یہ ہے کہ تماشا نہ دکھایا کوئی
شہر میں ہمدِ دیرینہ بہت تھے ناصر
وقت پڑنے پہ مرے کام نہ آیا کوئی

ناصر کاظمی



کیوں غمِ رفتگاں کرے کوئی

کیوں غمِ رفتگاں کرے کوئی
فکرِ وا ماندگاں کرے کوئی
تیرے آوارگانِ غربت کو
شاملِ کارواں کرے کوئی
زندگی کے عذاب کیا کم ہیں
کیوں غمِ لا مکاں کرے کوئی
دل ٹپکنے لگا ہے آنکھوں سے
اب کسے راز داں کرے کوئی
اس چمن میں برنگِ نکہتِ گل
عمر کیوں رائگاں کرے کوئی
شہر میں شور گھر میں تنہائی
دل کی باتیں کہاں کرے کوئی
یہ خرابے ضرور چمکیں گے
اعتبارِ خزاں کرے کوئی

ناصرِ ناطقی



گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ
بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دھن سنا کر
ستارہ شام بن کے آیا برنگِ خوابِ سحر گیا وہ
خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اُسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمہ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ
نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یونہی ذرا کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ
کچھ اب سنھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا دورِ آسماں بھی
جورات بھاری تھی ٹل گئی ہے جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ
بس ایک منزل ہے بواہوس کی ہزار رستے ہیں اہل دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ
شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ
مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی ستمگروں کی پلک نہ بھیگی
جو نالہ اٹھا تھا راتِ دل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ
وہ میکدے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ
وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

ناصر نظامی

گارہا تھا کوئی درختوں میں

گا رہا تھا کوئی درختوں میں
رات نیند آگئی درختوں میں
چاند نکلا افق کے غاروں سے
آگ سی لگ گئی درختوں میں
مینہ برسا تو برگ ریزوں نے
چھیڑ دی بانسری درختوں میں
یہ ہوا تھی کہ دھیان کا جھوٹکا
کس نے آواز دی درختوں میں
ہم ادھر گھر میں ہو گئے بے چین
دور آندھی چلی درختوں میں
لیے جاتے ہے موسموں کی پکار
اجنبی اجنبی درختوں میں
کتنی آبادیاں ہیں شہر سے دور
جا کے دیکھو کبھی درختوں میں
نیلے پیلے سفید لال ہرے
رنگ دیکھے سبھی درختوں میں
خوشبوؤں کی اداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں
دیر تک اُس کی تیز آنکھوں میں
روشنی سی رہی درختوں میں
چلتے چلتے ڈگر اجالوں کی
جانے کیوں مڑ گئی درختوں میں
سہم سہم تھے رات اہل چمن
تھا کوئی آدمی درختوں میں

ناصر نظامی



گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے
مٹی مٹی سی امیدیں تھکے تھکے سے خیال
بجھے بجھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے
ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا
یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہل دنیا نے
بقدر تشنہ لبی پرشش وفا نہ ہوئی
چھلک کے رہ گئے تیری نظر کے پیمانے
خیال آگیا مایوس رہ گزاروں کا
پلٹ کے آگئے منزل سے تیرے دیوانے
کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے
امید پرشش غم کس سے کیجیے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

ناصر ناطقی



گل نہیں ے نہیں پیالہ نہیں

گل نہیں ے نہیں پیالہ نہیں
کوئی بھی یادگارِ رفتہ نہیں
فرستِ شوق بن گئی دیوار
اب کہیں بھاگنے کا رستہ نہیں
ہوش کی تلخیاں مٹیں کیسے
جتنی پیتا ہوں اتنا نشہ نہیں
دل کی گہرائیوں میں ڈوب کے دیکھ
کوئی نغمہ خوشی کا نغمہ نہیں
غم بہر رنگِ دل کشا ہے مگر
سننے والوں کو تابِ نالہ نہیں
مجھ سے کہتی ہے موجِ صبح نشاط
پھول خیمہ ہے پیشِ خیمہ نہیں
ابھی وہ رنگِ دل میں بیچاں ہیں
جنہیں آواز سے علاقہ نہیں
ابھی وہ دشتِ منتظر ہیں مرے
جن پہ تحریرِ پائے ناقہ نہیں
یہ اندھیرے سلگ بھی سکتے ہیں
تیرے دل میں مگر وہ شعلہ نہیں
راکھ کا ڈھیر ہے وہ دل ناصر
جس کی دھڑکن صدائے تیشہ نہیں

ناصر کاظمی



گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ

گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
بستی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فنکار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ
جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان
دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ
ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ

ناصر کاظمی



گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل

گلی گلی مری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل
مجھ سے اتنی وحشت ہے تو میری حدوں سے دور نکل
ایک سے ترا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانوں پر
ایک یہ وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل
یاد ہے اب تک تجھ سے بچھڑنے کی وہ اندھیری شام مجھے
تو خاموش کھڑا تھا لیکن باتیں کرتا تھا کاجل
میں تو ایک نئی دنیا کی دھن میں بھٹکتا پھرتا ہوں
میری تجھ سے کیسے نہجے گی ایک ہیں تیرے فکر و عمل
میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے، دیکھ اس کالی رات کو دیکھ
میں وہی تیرا ہمراہی ہوں ساتھ مرے چلنا ہو تو چل

ناصر کاظمی



لبِ معجزیاں نے چھین لیا

لبِ معجزیاں نے چھین لیا
دل کا شعلہ زباں نے چھین لیا
دل مرا شب چراغ تھا جس کو
مرثۂ خوں چکاں نے چھین لیا
عمر بھر کی مسرتوں کا خمار
خلش ناگہاں نے چھین لیا
تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا
آ کے منزل پہ آنکھ بھر آئی
سب مزا رفتگاں نے چھین لیا
ہر گھڑی آسماں کو تکتا ہوں
جیسے کچھ آسماں نے چھین لیا
باغ سنسان ہو گیا ناصر
آج وہ گل خزاں نے چھین لیا

ناصر قاضی



مایوس نہ ہو اداس راہی

مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبح گاہی
اے منتظرِ طلوعِ فردا
بدلے گا جہانِ مرغ و ماہی
پھر خاک نشیں اٹھائیں گے سر
مٹنے کو ہے نازِ کج کلاہی
انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر دادِ طلب ہے بے گناہی
پھر اہلِ وفا کا دور ہوگا
ٹوٹے گا طلسمِ جم نگاہی
آئینِ جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

ناصر قاضی



محروم خواب دیدہ حیراں نہ تھا کبھی

محروم خواب دیدہ حیراں نہ تھا کبھی
تیرا یہ رنگ اے شبِ ہجراں نہ تھا کبھی
تھا لطفِ وصل اور کبھی افسونِ انتظار
یوں دردِ ہجر سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی
پرساں نہ تھا کوئی تو یہ رسوائیاں نہ تھیں
ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی
ہر چند غم بھی تھا مگر احساسِ غم نہ تھا
درماں نہ تھا تو ماتمِ درماں نہ تھا کبھی
دن بھی اُداس اور مری رات بھی اداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی
دورِ خزاں میں یوں مرا دل بے قرار ہے
میں جیسے آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی
بے کیف و بے نشاط نہ تھی اس قدر حیات
جینا اگرچہ عشق میں آساں نہ تھا کبھی

ناصر کاظمی



مَدّت ہوئی کہ سیر چمن کو ترس گئے

مَدّت ہوئی کہ سیر چمن کو ترس گئے
گل کیا غبارِ بوئے سمن کو ترس گئے
!ہاں اے سکوتِ تشنگی درد کچھ تو بول
کانٹے زباں کے آبِ سخن کو ترس گئے
دل میں کوئی صدا ہے نہ آنکھوں میں کوئی رنگ
تن کے رفیقِ صحبتِ تن کو ترس گئے
اس عہدِ نو میں و درِ متاعِ وفا نہیں
اس رسم و راہِ عہدِ کہن کو ترس گئے
منزلوں کی ٹھنڈکوں نے لہو سرد کر دیا
جی سست ہے کہ پاؤں چبھن کو ترس گئے
اندھیر ہے کہ جلوۂ جاناں کے باوجود
کوچے نظر کے ایک کرن کو ترس گئے

ناصرِ ناظمی



مسلل بے کلی دل کو رہی ہے

مسلل بے کلی دل کو رہی ہے
مگر جینے کی صورت تو رہی ہے
میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے
چل دل سے امیدوں کی مسافر
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے
نہ سمجھو تم اسے شور بھاراں
خزاں پتوں میں چھپ کر رو رہی ہے
ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر قاضی



ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے

ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے
گو باغباں یہ کنج چمن مجھ سے سے چھین لے
گر احترامِ رسمِ وفا ہے تو اے خدا
یہ احترامِ رسمِ کہن مجھ سے چھین لے
منظرِ دل و نگاہ کے جب ہو گئے اداس
یہ بے فضا علاقہ تن مجھ سے چھین لے
گل ریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ
گل چیں کا بس چلے تو یہ فن مجھ سے چھین لے
سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
!کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے

ناصر قاضی



موسم گلزارِ ہستی ان دنوں کیا ہے نہ پوچھ

موسم گلزارِ ہستی ان دنوں کیا ہے نہ پوچھ
تو نے جو دیکھا سنا کیا میں نے دیکھا ہے نہ پوچھ
ہاتھ زخمی ہیں تو پلکوں سے گل منظر اٹھا
پھول تیرے ہیں نہ میرے باغ کس کا ہے نہ پوچھ
رات اندھیری ہے تو اپنے دھیان کی مشعل جلا
قافلے والوں میں کس کو کس کی پروا ہے نہ پوچھ
جو ترا محرم ملا اس کو نہ تھی اپنی خبر
شہر میں تیرا پتہ کس کس سے پوچھا ہے نہ پوچھ

ناصر کاظمی



میں نے جب لکھنا سیکھا تھا

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
تو نے کیوں مترا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا
تیرے گھر کے دروازے پر
سورج ننگے پاؤں کھڑا تھا

ناصر کاظمی



میں ہوں رات کا ایک بجا ہے

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے
آج تو یوں خاموش ہے دنیا
جیسے کچھ ہونے والا ہے
کیسی اندھیری رات ہے دیکھو
اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے
آج تو شہر کی روش روش پر
پتوں کا میلہ سا لگا ہے
آؤ گھاس پہ سبھا جمائیں
میخانہ تو بند پڑا ہے
پھول تو سارے جھڑ گئے لیکن
تیری یاد کا زخم ہرا ہے
تو نے جتنا پیار کیا تھا
دکھ بھی مجھے اتنا ہی دیا ہے
یہ بھی ہے ایک طرح کی محبت
میں تجھ سے تو مجھ سے جدا ہے
یہ تری منزل وہ مرا رستہ
تیرا میرا ساتھ ہی کیا ہے
میں نے تو اک بات کہی تھی
کیا تو سچ چُج روٹھ گیا ہے
ایسا گاہک کون ہے جس نے
سکھ دے کر دکھ مول لیا ہے
تیرا رستہ تکتے تکتے
کھیت گگن کا سوکھ چلا ہے
کھڑکی کھول کے دیکھ تو باہر
دیر سے کوئی شخص کھڑا ہے
ساری بستی سو گئی ناصر
تو اب تک کیوں جاگ رہا ہے

ناصر علی

نئے دیس کا رنگ نیا تھا

نئے دیس کا رنگ نیا تھا
دھرتی سے آکاش ملا تھا
دُور کے دریاؤں کا سونا
ہرے سمندر میں گرتا تھا
چلتی ندیاں ، گارے نوکے
نوکوں میں اک شہر بسا تھا
نوکے ہی میں رین بسیرا
نوکے ہی میں دن کٹتا تھا
نوکا ہی بچوں کا جھولا
نوکا ہی پیری کا عصا تھا
مچھلی جال میں تڑپ رہی تھی
نوکا لہروں میں اُلجھا تھا
ہنستا پانی، روتا پانی
مجھ کو آوازیں دیتا تھا
تیرے دھیان کی کشتی لے کر
میں نے دریا پار کیا تھا

ناصر قاضی



نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے
جس دھوپ کی دل میں ٹھنڈک تھی وہ دھوپ اسی کے ساتھ گئی
ان جلتی بھتی گلیوں میں اب خاک اڑاؤں کس کے لیے
وہ شہر میں تھا تو اس کے لیے اوروں سے بھی ملنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے
اب شہر میں اُس کا بدل ہی نہیں کوئی ویسا جانِ غزل ہی نہیں
ایوانِ غزل میں لفظوں کے گلدان سجاؤں کس کے لیے
مدت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا
ان خالی کمروں میں ناصر اب شمع جلاؤں کس کے لیے

ناصر قاضی



ناز بیگانگی میں کیا کچھ تھا

نازِ بیگانگی میں کیا کچھ تھا
حسن کی سادگی میں کیا کچھ تھا
لاکھ راہیں تھیں لاکھ جلوے تھے
عہدِ آوارگی میں کیا کچھ تھا
آنکھ کھلتے ہی چھپ گئی ہر شے
عالم بے خودی میں کیا کچھ تھا
یاد ہیں مرحلے محبت کے
ہائے اس بے کلی میں کیا کچھ تھا
کتنے بیٹے دنوں کی یاد آئی
آج تیری کمی میں کیا کچھ تھا
کتنے مانوس لوگ یاد آئے
صبح کی چاندنی میں کیا کچھ تھا
رات بھر ہم نہ سو سکے ناصر
پردہ خامشی میں کیا کچھ تھا

ناصرِ ناظمی



ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے

ناصر کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بہتر ہے
کل جو تھا وہ آج نہیں جو آج ہے وہ کل مٹ جائے گا
روکھی سوکھی جو مل جائے شکر کرو تو بہتر ہے
کل یہ تاب و تواں نہ رہے گی ٹھنڈا ہو جائے گا لہو
نام خدا ہو جوان ابھی کچھ کر گزرو تو بہتر ہے
کیا جانے کیا رت بدلے حالات کا کوئی ٹھیک نہیں
اب کے سفر میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو تو بہتر ہے
کپڑے بدل کر بال بنا کر کہاں چلے ہو کس کے لیے
رات بہت کالی ہے ناصر گھر میں رہو تو بہتر ہے

ناصر قاضی



نیت نئی سوچ میں لگے رہنا

نیت نئی سوچ میں لگے رہنا
ہمیں ہر حال میں غزل کہنا
صحنِ مکتب میں ہم سنوں کے ساتھ
سنگ ریزوں کو ڈھونڈتے رہنا
گھر کے آنگن میں آدھی آدھی رات
مل کے باہم کہانیاں کہنا
دن چڑھے چھاؤں میں ببولوں کی
رم آہو کو دیکھتے رہنا
ابر پاروں کو، سبزہ زاروں کو
دیکھتے رہنا، سوچتے رہنا
شہر والوں سے چھپ کے پچھلی رات
چاند میں بیٹھ کر غزل کہنا
ریت کے پھول آگ کے تارے
یہ ہے فصلِ مراد کا گہنا
سوچتا ہوں کہ سنگِ منزل نے
چاندنی کا لباس کیوں پہنا
کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا

ناصر کاظمی



نصیب عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں

نصیب عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں
بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں
تلافی ستم روزگار کون کرے
تو ہم سخن بھی نہیں، راز دار بھی تو نہیں
زمانہ پرش غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار بھی تو نہیں
تو ہی بتا کہ تری خاموشی کو کیا سمجھوں
تری نگاہ سے کچھ آشکار بھی تو نہیں
وفا نہیں نہ سہی، رسم و راہ کیا کم ہے
تری نظر کا مگر اعتبار بھی تو نہیں
!اگرچہ دل تری منزل نہ بن سکا اے دوست
مگر چراغِ سرِ رہ گزار بھی تو نہیں
بہت فسرده ہے دل، کون اس کو بہلائے
اُداس بھی تو نہیں، بے قرار بھی تو نہیں

ناصرِ قاضی



نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے

نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے
بہاروں میں اب کی نئے گل کھلے
نہ جانے کہاں لے گئے قافلے
مسافر بڑی دور جا کر ملے
وہی وقت کی قید ہے درمیاں
وہی منزلیں اور وہی فاصلے
جہاں کوئی بستی نظر آ گئی
وہیں رک گئے اجنبی قافلے
تمھیں دل گرفتہ نہیں ساتھیو
ہمیں بھی زمانے سے ہیں کچھ گلے
ہمیں بھی کریں یاد اہل چمن
چمن میں اگر کوئی غنچہ کھلے
ابھی اور کتنی ہے میعادِ غم
کہاں تک ملیں گے وفا کے صلے

ناصر قاضی



نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اتر نہ جائے کہیں
آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں
نہ ملا کر اداس لوگوں سے
حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں
آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں
جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں
آو کچھ دیر رو ہی لیں ناصر
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

ناصر قاضی



ہنتے گاتے روتے پھول

ہنتے گاتے روتے پھول
 جی میں ہیں کیسے کیسے پھول
 اور بہت کیا کرنے ہیں
 کافی ہیں یہ تھوڑے پھول
 وقت کی پھلکاری میں نہیں
 دامن میں ہیں ایسے پھول
 اس دھرتی کی رونق ہیں
 میرے کانٹے تیرے پھول
 کیسے اندھے ہیں وہ ہاتھ
 جن ہاتھوں نے توڑے پھول
 اُن پیاسوں پر میرا سلام
 جن کی خاک سے نکلے پھول
 ایک ہری کوئیل کے لیے
 میں نے چھوڑے کتنے پھول
 اونچے اونچے لے پھول
 سادے پتے پیلے پھول
 مٹی ہی سے نکلے تھے
 مٹی ہو گئے سارے پھول
 مٹی کی خوشبو لینے
 نیل گھنگھریلے سے اتارے پھول
 چادر اوڑھ کے شبنم کی
 نکلے آنکھوں ملتے پھول
 شام ہوئی اب گلیوں میں
 دیکھو چلتے پھرتے پھول
 سونا جسم سفید قمیص
 گورے ہاتھ سنہرے پھول
 کچی عمریں کچے رنگ
 ہنس کھ بھولے بھالے پھول
 آنکھ آنکھ میں بھیگی نیند
 ہونٹ ہونٹ سے جھڑتے پھول
 گورے گورے ننگے پیر
 جھلمل جھلمل کرتے پھول
 جیسا بدن ویسا ہی لباس
 جیسی مٹی ویسے پھول
 مہک انھی پھر دل کی کتاب
 یاد آئے یہ کب کے پھول
 شام کے تارے تو ہی بتا
 آج کدھر سے گزرے پھول
 کانٹے چھوڑ گئی آندھی
 لے گئی اچھے اچھے پھول
 دھیان میں پھرتے ہیں ناصر
 اچھی آنکھوں والے پھول

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دل کسے نصیب یہ توفیق اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی
تیرے کرم سے اے اَلمِ حسن آفریں
دل بن گیا ہے دوست کی خلوت کبھی کبھی
جوشِ جنوں میں درد کی طغیانوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی
تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی
کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی
اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ناصرِ ناظمی



واہوا پھر درے خانہ گل

واہوا پھر درے خانہ گل
پھر صبا لائی ہے پیانہ گل
زمزمہ ریز ہوئے اہل چمن
پھر چراغاں ہوا کاشانہ گل
رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آئی ہے نذرانہ گل
پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانہ گل
پھر کسی گل کا اشارہ پا کر
چاند نکلا سرے خانہ گل
پھر سر شام کوئی شعلہ نوا
سو گیا چھیڑ کے افسانہ گل
آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانہ گل
آج ہم خاک بر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونق کاشانہ گل
ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانہ گل
کل ترا دور تھا اے بادِ صبا
ہم ہیں اب سرخی افسانہ گل

ناصر قاضی



وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں

وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں
تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لیے کوئی شایان التماس نہیں
ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں
کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب اُن دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں
گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں
مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

ناصر کاظمی



وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے
میں اُن کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے
یہ کون لوگ ہیں مرے ادھر ادھر
وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے
وہ دل میں کھنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے
عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے
اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے
یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمین کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

ناصر قاضی



یاد آتا ہے روز و شب کوئی

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی
لب جو چھاؤں میں درختوں کی
وہ ملاقات تھی عجب کوئی
جب تجھے پہلی بار دیکھا تھا
وہ بھی تھا موسمِ طرب کوئی
کچھ خبر لے کہ تیری محفل سے
دور بیٹھا ہے جاں بلب کوئی
نہ غمِ زندگی نہ دردِ فراق
دل میں یوں ہی سی ہے طلب کوئی
یاد آتی ہیں دور کی باتیں
پیار دے دیکھتا ہے جب کوئی
چوٹ کھائی ہے بارہا لیکن
آج تو درد ہے عجب کوئی
جن کو مٹنا تھا مٹ چکے ناصر
اُن کو رسوا کرے نہ اب کوئی

ناصر قاضی



یاس میں جب کوئی آنسو نکلا

یاس میں جب کوئی آنسو نکلا
اک نئی آس کا پہلو نکلا
لے اڑی سبزہ خود رو کی مہک
پھر تری یاد کا پہلو نکلا
میٹھی بولی میں پیچھے بولے
گنگناتا ہوا جب تو نکلا
آئیں ساون کی اندھیری راتیں
کہیں تارا کہیں حبگو نکلا
نئے مضمون سُجھاتی ہے صبا
کیا ادھر سے وہ سمن بو نکلا
پاؤں چلنے لگی جلتی ہوئی ریت
دشت سے جب کوئی آہو نکلا
کئی دن رات سفر میں گزرے
آج تو چاند لب جو نکلا
طاقِ میخانہ میں چاہی تھی اماں
وہ بھی تیرا حنم ابرو نکلا
اہل دل سیرِ حُسن سے بھی گئے
عکس گل سایہ گیسو نکلا
واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

ناصر نظامی



یہ بھی کیا شام ملاقات آئی

یہ بھی کیا شام ملاقات آئی
لب پہ مشکل سے تیری بات آئی
صبح سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب
ہائے کیا ہوگا اگر رات آئی
بستیاں چھوڑ کے برے بادل
کس قیامت کی یہ برسات آئی
کوئی جب مل کے ہوا تھا رخصت
دل بے تاب وہی رات آئی
سایہ زلفِ بتاں میں ناصر
ایک سے ایک نئی رات آئی

ناصر قاضی



یہ خوابِ سبز ہے یارت وہی پلٹ آئی

یہ خوابِ سبز ہے یارِ ت وہی پلٹ آئی
چھتوں پہ گھاس ہوا میں نمی پلٹ آئی
کچھ اس ادا سے دکھایا ہے تیری یاد نے دل
وہ لہر سی جو رگ و پے میں تھی پلٹ آئی
تری ہنسی کے گلابوں کو کوئی چھو نہ سکا
صبا بھی چند قدم ہی گئی، پلٹ آئی
خبر نہیں وہ مرے ہمسفر کہاں پہنچے
کہ رہگزر تو مرے ساتھ ہی پلٹ آئی
کہاں سے لاؤ گے ناصر وہ چاند سی صورت
گر اتفاق سے وہ رات بھی پلٹ آئی

ناصر قاضی



یہ رات تمھاری ہے، چمکتے رہو تارو

یہ رات تمھاری ہے، چمکتے رہو تارو
وہ آئیں نہ آئیں، مگر امید نہ ہارو
شاید کسی منزل سے کوئی قافلہ آئے
آشفۃ سرو صبح تلک یوں ہی پکارو
دن بھر تو چلے اب ذرا دم لے کے چلیں گے
اے ہم سفر آج یہیں رات گزارو
یہ عالم وحشت ہے تو کچھ ہو کے رہے گا
منزل نہ سہی، سر کسی دیوار سے مارو
اوجھل ہوئے جاتے ہیں نگاہوں سے دو عالم
تم آج کہاں ہو غمِ فرقت کے سہارو
کھویا ہے اسے جس کا بدل کوئی نہیں ہے
یہ بات مگر کون سنے، لاکھ پکارو

ناصر نظامی



یہ رنگِ خوں ہے گلوں پر نکھار اگر ہے بھی

یہ رنگِ خوں ہے گلوں پر نکھار اگر ہے بھی
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
یہ پیشِ خیمہٗ بیدادِ تازہ ہو نہ کہیں
بدل رہی ہے ہوا سازگار اگر ہے بھی
لہو کی شمسِ جلاؤ قدم بڑھاتے چلو
سروں پہ سایہٗ شب ہائے تار اگر ہے ابھی
ابھی تو گرم ہے میخانہٗ جامِ کھنکاو
بلا سے سر پہ کسی کا ادھار اگر ہے بھی
حیاتِ درد کو آلودہٗ نشاط نہ کر
یہ کاروبار کوئی کاروبار اگر ہے بھی
یہ امتیازِ من و تو خدا کے بندوں سے
وہ آدمی نہیں طاعت گزار اگر ہے بھی
نہ پوچھ کیسی گزرتی ہے زندگی ناصر
بس ایک جبر ہے یہ اختیار اگر ہے بھی

ناصرِ قاضی



یہ شب یہ خیال و خواب تیرے

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے
آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصل گل کا
شاخوں پہ چلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

ناصر قاضی



یہ کہہ رہا ہے دیارِ طرب کا نظارا

یہ کہہ رہا ہے دیارِ طرب کا نظارا
یہیں ملے گا مجھے میرا انجمن آرا
خیالِ حسن میں کتنا بہار پرور ہے
شبِ خزاں کی خنک چاندنی کا نظارا
چلے تو ہیں جسِ گل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا
چلو کہ برف گھٹنے کی صبح آ پہنچی
خبر بہار کی لایا ہے کوئی گلِ پارا
چلے چلو انھیں گم نام برف زاروں میں
عجب نہیں یہیں مل جائے درد کا چارا
کسے مجال کہ رُک جائے سانس لینے کو
رواں دواں لیے جاتا ہے وقت کا دھارا
بگولے یوں اڑے پھرتے ہیں خشک جنگل میں
تلاشِ آب میں جیسے غزالِ آوارا
ہمیں وہ برگِ خزاں دیدہ ہیں جنھیں ناصر
چمن میں ڈھونڈتی پھرتی ہے بوئے آوارا

ناصرِ قاضی

